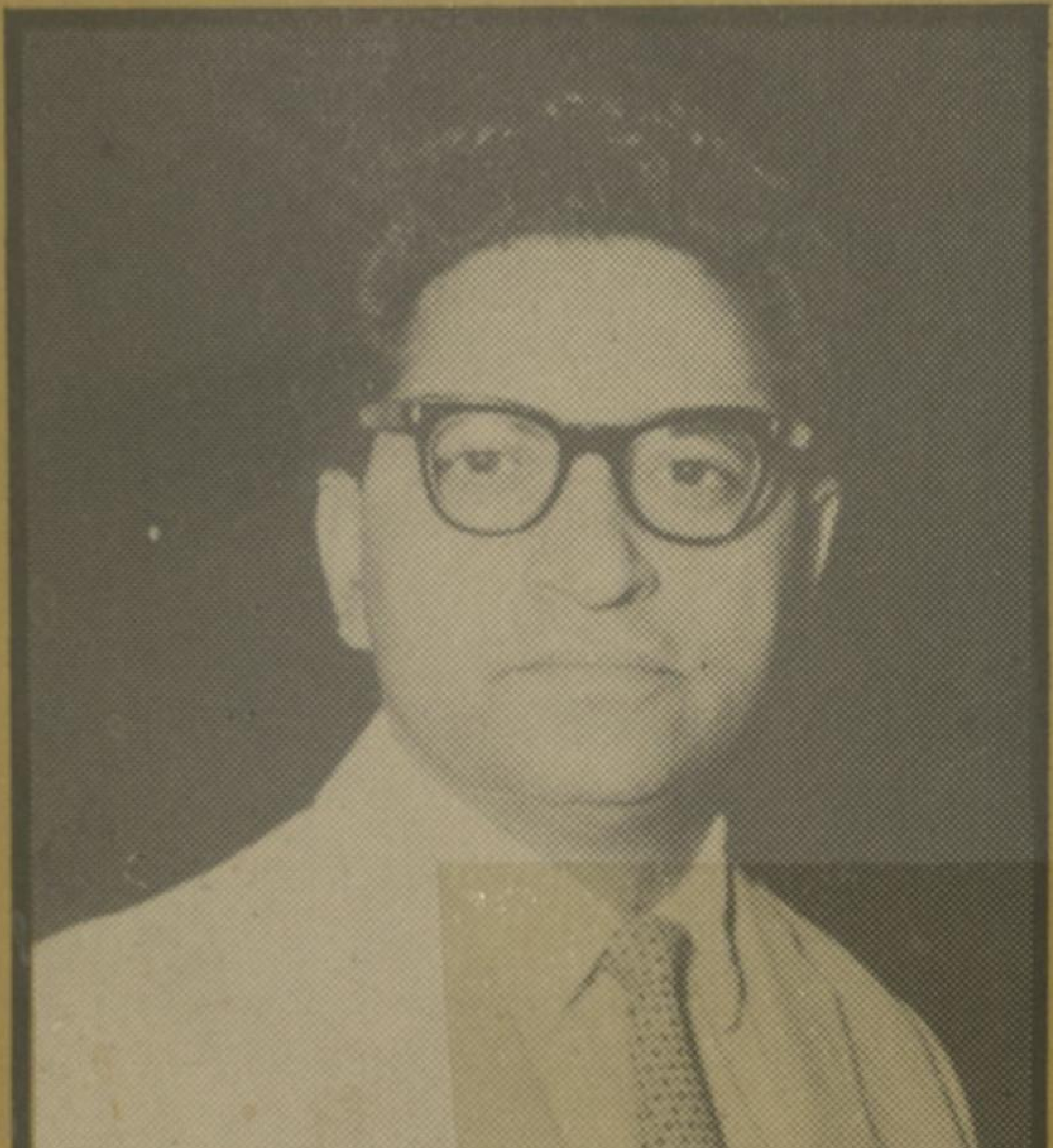
محسنِ صحافت



مشرق

مُحسنِ صحافت

○

مرّتب

اقبال زبیری

چیف ایڈیٹر، روزنامہ مشرق

○

ناشر

ادارہ مشرق لاہور

سال طبع ——— جولائی ۱۹۷۸ء

تعداد ——— ایک ہزار

طابع ——— امین کاشمیری، مشرق پریس لاہور

ناشر ——— ادارۂ مشرق ۔ ۷، ایبٹ روڈ لاہور

قیمت ——— دس روپے

مندرجات

انتساب

اُن کے نام جو صحرا میں پھُول کھلاتے ہیں

پیش لفظ

اس صدی کے تیسرے ربع میں اردو صحافت جس انقلاب سے آشنا ہوئی، اگر اس کی تاریخ مرتب کی جائے تو اس میں عنایت اللہ صاحب کا نام سب سے نمایاں ہوگا۔ ان کی شخصیت ایک ایسے وقت اُبھری جب اردو صحافت اپنی تمام روایات اور تابانیوں کے باوجود انگریزی صحافت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اردو اخباروں کی اشاعتیں اتنی کم تھیں کہ وہ اس معاملے میں انگریزی اخباروں سے سبقت لے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور اردو اخبار نویسوں کی تنخواہیں اتنی معمولی تھیں اور ان کا وقار اتنا کم تھا کہ وہ انگریزی زبان کے اخبار نویسوں کے مقابلے میں اچھوت نظر آتے تھے۔ عنایت صاحب نے پورے جذب و جنوں کے ساتھ ایسے حالات پیدا کئے کہ اردو اخبارات نے میدانِ صحافت میں زبردست پیش قدمی کی اور انگریزی اخبارات نہ صرف پسپا ہو گئے بلکہ ان کی اشاعتیں بھی جامد ہو گئیں۔ یہ ان کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج اشاعت کے اعتبار سے انگریزی اخبار اردو اخباروں کی گرد تک نہیں پہنچتے اور یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ اگر ملک کے تمام انگریزی روزناموں کی اشاعتیں جمع بھی کر لی جائیں تو بھی وہ

دو کثیرالاشاعت روزناموں میں سے ایک کی اشاعت سے بھی کم نظر آئیں گی۔

عنایت صاحب نے اُردو اخبار نویسوں کو معقول مشاہرے دیتے اور جب پہلے اجرت بورڈ نے اپنے ایوارڈ میں اُردو اور انگریزی اخباروں کو برابر کی سطح پر رکھ دیا تو عنایت صاحب نے نہ صرف اس فیصلے پر پوری طرح عمل کیا بلکہ اچھے کارکنوں کو مقررہ گریڈوں سے زیادہ تنخواہیں دیں۔ کوہستان اور اس کے بعد مشرق ملک کے وہ منفرد اخبارات ہیں جن کے غیر صحافی کارکنوں کو بھی عنایت صاحب نے وہی معاوضے اور مراعات دیں جو اُجرت بورڈ میں صرف کارکن صحافیوں کے لئے مقرر کی گئی تھیں۔ اس طرح انہوں نے آج سے دس سال پہلے ہی اخباری کارکنوں کے درمیان مروجہ امتیاز ختم کر دیا اور ان کی مالی حالت بہتر بنا کر ان کے وقار میں اضافہ کیا۔

عنایت صاحب کا مطالعہ وسیع تھا۔ مغربی دُنیا میں صحافت پر انگریزی زبان میں جو نئی کتاب چھپی، انہوں نے اس کا غور سے مطالعہ کیا۔ کئی بار برطانیہ جا کر وہاں کی صحافت کا جائزہ لیا بلکہ بعض کہنہ مشق برطانوی صحافیوں کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ کیا اور اس طرح صحافت کے فنی پہلوؤں میں دسترس حاصل کی اور جس جس پہلو کو قابلِ تقلید پایا اسے پاکستان میں آزمایا۔ پاکستانی صحافت کا بھی گہرا مطالعہ کیا، اس کی ترقی کے امکانات پر غور کیا، اپنی قوتِ متخیلہ سے بھی فائدہ اٹھایا اور یہاں کی صحافت کو ایسا رنگ دیا جو عوام کی آرزوؤں اور امنگوں سے ہم آہنگ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو اُردو صحافت صرف ایک خاص طبقے میں محدود تھی، اس کے لئے ایک وسیع میدان پیدا ہو گیا۔ چونکہ انہوں نے اپنے اخباروں کو صحافتی کیل کانٹے سے لیس کر دیا، اس لئے انہوں نے معاشرے میں اس قدر نفوذ کیا کہ ایک تو لوگ انگریزی اخباروں سے بے نیاز ہو گئے، دوسرے اخباروں میں پورے

پورے کنبے دلچسپی لینے لگے، تیسرے عوام الناس میں اخبار بینی کا ذوق اس طرح پیدا ہوا کہ وہ برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

فنّی اعتبار سے عنایت صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اُردو صحافت کو لیتھو کے قدیم طریقِ طباعت سے نجات دلائی جو اس کی ترقی میں سدِراہ بنا ہوا تھا۔ اس کی جگہ انہوں نے آفسٹ کا جدید ترین طریق طباعت اپنایا اور ثابت کر دکھایا کہ اردو اخبارات کی طباعت کے لئے یہی مناسب اور بہترین طریق کار ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ تمام اخبارات جو اسے مشکل، گراں اور ناقابلِ عمل طریق طباعت سمجھتے تھے آفسٹ مشینوں پر چھپنے لگے۔ اسی طرح عنایت صاحب نے اخبار کی کتابت اور رے آوٹ کے فنّی اصول وضوابط مرتب کرائے اور اس کی عملی تربیت کا اہتمام کیا۔ اس وقت اردو اخبار تصویری صحافت سے قریب قریب ناآشنا تھے۔ آفسٹ طریق طباعت اور دیدہ زیب لے آوٹ سے تصویری صحافت خوب ابھری اور اس نے بھی اخبارات کے حسن وجمال اور ہردلعزیزی کو دو آتشہ کرنے میں بہت مدد دی۔

عنایت صاحب میرے استاد تھے، دوست تھے اور ساتھی تھے اور میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک انسان کی حیثیت سے، اخباری کارکنوں کے بہی خواہ کی حیثیت سے اور اخبارنویس کی حیثیت سے وہ بے نظیر خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ نیکی و شرافت اور درویشی اور خودداری کا پیکر تھے۔ محنت و دیانت اور صبر و قناعت کو اصولِ زندگی سمجھتے تھے۔ آزادیٔ صحافت پر ایمان رکھتے تھے اور جرأت و بیباکی ان کے کردار کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ جری، حوصلہ مند اور شفیق انسان تھے۔ انہوں نے اپنے اداروں کی تشکیل ایک خاندان کی حیثیت سے کی۔ ایڈیٹر سے لے کر ہاکر تک ہر فرد کو اپنا عزیز جانا اور اس کی بھلائی میں ذاتی دلچسپی لی۔ وہ کارکنوں کو

سونے کا نوالہ کھلانے اور کام لیتے وقت شیر کی آنکھ سے دیکھنے کے قائل تھے۔ اس طرح انہوں نے فرض شناس اور مستعد ساتھیوں کی ایک مضبوط ٹیم تیار کی جو ادارے کی خاطر اپنا سب کچھ تج دینے کو تیار رہتے تھے۔ یہ بات بیشتر دوسرے اداروں میں آج بھی مفقود ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر میں نے مناسب سمجھا کہ عنایت صاحب کی زندگی اور کردار کے مختلف پہلوؤں پر ابواب کی صورت میں ایک کتاب مرتب کر لی جائے لیکن میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ کتاب ان کی شخصیت کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔ میں اسے ایک ابتدائی جائزہ قرار دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ جب صحافت کے کسی مؤرخ نے تحقیق کا ڈول ڈالا تو عنایت صاحب کا عظیم کردار زیادہ کھل کر اجاگر ہو گا۔

اقبال زبیری

رفاقت کی داستان

اپنے شفیق استاد اور محسن عنایت صاحب کی برسی پر انہیں مرحوم لکھتے ہوتے میرا قلم تھرا رہا ہے۔ مجھے ان کی جان لیوا علالت کے آخری دو ماہ کی ایک ایک تفصیل یاد ہے، میری نظروں کے سامنے ان کی شمع زندگی کی لو دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی، ان پر نزع کی کیفیت بھی میرے سامنے طاری ہوتی اور پھر ان کی میت کو بھی میں اپنے ہاتھوں سے آتار چکا ہوں مگر اس کے باوجود دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو شخص سراپا زندگی اور عزم و عمل کا کوہِ گراں تھا وہ موت سے سچ مچ مات کھا چکا ہے۔

عنایت صاحب سے میری رفاقت کا آغاز اب سے ۲۳ سال قبل راولپنڈی میں روزنامہ تعمیر سے ہوا تھا۔ میں اس اخبار کے عملہ ادارت میں شامل تھا۔ عنایت صاحب تعمیر نکلنے کے کچھ عرصہ بعد بیمار ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ صحت یاب ہونے کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ تعمیر میں کام کیا اور پھر اس سے قطع تعلق کر لیا۔

روزنامہ تعمیر اپنے قلیل وسائل کے باوجود مُلک کے مؤقر اخبارات کی صف میں شامل ہو گیا مگر تعمیر کی عظمت کو چار چاند لگانے کے دوران ان کی اپنی صحت کو گھن لگ گیا، شب و روز کی مسلسل محنت اور غذا، آرام اور نیند کے اوقات سے غفلت کے نتیجے میں

وہ علیل ہوگئے۔ ان کی علالت کا یہ دور بڑا جاں گسل ثابت ہوا اور جب طویل علاج معالجے کے بعد وہ صحت یاب ہوتے۔ تو اپنے ایک پھیپھڑے اور چھ پسلیوں سے محروم ہوچکے تھے مگر ان کا عزم و حوصلہ پہلے سے بھی زیادہ بیدار اور توانا ہوگیا تھا۔ اب ان کے ذہن میں تعمیر سے بھی بہتر اور معیاری اخبار کے اجرا کا خاکہ تھا مگر جہاں تعمیر کی پشت پر ایک بڑے اشاعتی ادارے کے وسائل تھے وہاں عنایت صاحب کے پاس صرف سات ہزار روپے کی پونجی تھی جو انہیں ادارہ تعمیر سے زمانہ علالت کی تنخواہ کے طور پر وصول ہوئی تھی۔

اس بے سرو سامانی کے عالم میں انہوں نے راولپنڈی سے روزنامہ کوہستان کا اجرا کیا اور میں ان کے ساتھ ہی تعمیر چھوڑ کر کوہستان میں آگیا اور پھر میرا اور ان کا ساتھ ان کی موت کے بعد ہی چھوٹا۔ وہ دور سخت مصائب اور مشکلات کا دور تھا۔ اخباری ادارے مالی بحران کا شکار تھے اور کارکنوں کو نہایت قلیل معاوضے ملتے تھے۔ میں نے دکھوں اور تکلیفوں کا یہ سارا عرصہ عنایت صاحب کے ساتھ گزارا۔ کوہستان کے زمانے میں ایسا وقت بھی آیا کہ کئی کئی ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتی تھیں، دفتر کے پاس کاغذ اور سیاہی خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے اور ہم لوگ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو ترستے تھے۔ بعض اوقات اخبار شائع کرنے کے لئے سو سو روپے ادھار مانگنے پڑے اور گھر کی ضروریات کے لئے پورے مہینے میں بمشکل پچاس روپے بھی میسر نہ آسکے۔ اس کٹھن دور میں عنایت صاحب نے جس عزم اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا اور ان کے رفقا نے جس ثابت قدمی سے اپنے رہنما کا ساتھ دیا یہ بذات خود ایک ولولہ انگیز داستان ہے۔

عنایت صاحب نے جن مشکلات، زبوں حالی اور مالی وسائل کے بغیر روزنامہ صحافت میں اپنے پہلے تجربے کو کامیاب بنایا اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ ذاتی آرام و آسائش پر اخبار کی فلاح اور ترقی کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے اور دفتر کے ساتھ

ایک چھوٹے سے کمرہ میں رہتے تھے۔ ایک اخبار کے مینجنگ ایڈیٹر ہونے کے باوجود وہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ اور بعض اوقات ان کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہوتی تھی کہ ریل کا کرایہ ادا کر سکیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دورے میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ہم دوپہر کا کھانا نہ کھا سکے۔ ایک اور موقع پر عنایت صاحب کی پھٹی ہوئی قمیض مرمت کرانے کے لئے مجھے ایک درزی کی خوشامد کرنی پڑی۔ کیونکہ ہماری جیب میں درزی کو معمولی معاوضہ دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اخباری صنعت میں آج جو خوشحالی اور اطمینان ہے اس صنعت میں بعد میں شامل ہونے والے لوگ ان مصائب اور مشکلات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

اس وقت کسے اندازہ تھا کہ یہ بے وسیلہ اور علاقائی اخبار چند سال کے اندر ہی اندر اپنے وقت کا سب سے بڑا اخبار بن جائے گا۔ مگر عنایت صاحب کی جدّت پسندی اور مہم جویانہ صلاحیتوں نے یہ معجزہ بھی کر دکھایا۔ انہوں نے کوہستان میں پہلی بار صحافتی تکنیک میں یکسر انقلابی تجربات کئے۔ سب سے پہلے انہوں نے لیتھو طباعت کے پرانے طریق کار کو خیر باد کہا اور آفسٹ مشینوں پر ونڈ ائنک طرز اختیار کیا۔ یہ اردو صحافت کے ارتقاء میں بڑا انقلاب آفریں اقدام ثابت ہوا اس کے ساتھ ہی انہوں نے مصور صحافت کی طرح ڈالی اور اخباری صنعت کو آرٹ کے نئے شعبے سے روشناس کیا اس سے صحافت کے صوری محاسن میں چار چاند لگ گئے۔

آرٹ سیکشن کی تنظیم میں عنایت صاحب کو خاص طور پر بڑی محنت کرنا پڑی۔ اس کی صرف یہی وجہ نہ تھی کہ اردو صحافت کے لئے یہ ایک نیا شعبہ تھا بلکہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اخبارات کے مالکان بلکہ خود صحافیوں کی ایک بڑی تعداد بھی ذہنی طور پر اس جدّت کو قبول کرنے پر آمادہ نظر نہ آتی تھی۔ مالکان کو یہ احساس تھا کہ اخبارات کو حسن صورت عطا کرنے کی اس تحریک سے طباعت کے اخراجات بڑھیں گے اور ان کے منافع میں کمی واقع ہوگی۔ صحافیوں میں سے جو لوگ لگے بندھے انداز میں کام کر رہے تھے ان کا خیال

تھا کہ اس طرح ان کا کام مشکل ہو جائے گا۔ انہیں زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ اس لئے ان دونوں حلقوں نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ کوہستان میں جہاں عنایت صاحب نے اس تجربہ کا آغاز کیا انہیں کارکنوں کی ایک ایسی ٹیم میسّر تھی جو اخبار کو بہتر بنانے اور صحافت کی ترقی کے لئے ہر ممکن جدوجہد کرنے اور سخت سے سخت کام انجام دینے کے لئے تیار تھے لیکن دوسرے اخبارات نے اس تبدیلی کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ اور اخبار میں تصاویر کی اشاعت، طباعت میں ایک سے زائد رنگوں کے استعمال اور اخبار کی تدوین میں حسن نظر اور جاذبیت کے نقطۂ نظر سے سیدھے کالموں میں سنگل اور دو کالمی سرخیاں لگانے کی بجائے پیش کش کے نئے انداز کو گھٹیا پن قرار دینے کی مہم قرار دیا۔ بڑے بڑے ترقی پسند اور سکہ بند اخبار نویسوں نے اپنے مزاحیہ کالموں میں اسے اخبار میں سُرخی پاؤڈر اور ہلدی مرچیں لگانے سے تعبیر کیا۔ لیکن عنایت صاحب اس پراپیگنڈے سے متاثر نہ ہوتے۔

عنایت صاحب کی توجہ صرف اپنے ساتھیوں اور اپنے کام پر مرکوز رہا کرتی تھی انہوں نے اپنے رفقاء کار کو اخبار کے "میک اپ" کے جدید تصوّرات سے آگاہ کیا جس کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ جو چیز بھی کسی شخص کے ہاتھ فروخت کرنی مقصود ہو اسے صاف ستھرا اور دیدہ زیب ہونا چاہیئے۔ دُوسرے یہ کہ اخبار کے قارئین کو نفسیاتی اور طبّی نقطۂ نظر سے باریک الفاظ کے ایک لامتناہی سلسلے کو پڑھنے کے تھکا دینے والے عمل سے نجات دلانا ضروری ہے۔ اخبارات میں ایک ہی سائز کے قلم سے ایک ہی انداز میں جو طویل عبارت شائع کی جاتی ہے اس کا مسلسل اور ہر روز مطالعہ انسان کی بینائی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کے ذہن کو بھی تھکا دیتا ہے۔ اس لئے اخبار کے میک اپ میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہر خبر کو پڑھنے کے بعد قاری کی آنکھوں اور ذہن کو ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہو۔ اس طرح اخبار کی کتابت کے معاملہ میں خفی یا جلی قلم کا فرق بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس

کا مقصد بھی یہی ہے کہ قاری کو مطالعے کے دوران یا تحریر کی یکسانیت سے نجات دلا کر ذہنی سکون فراہم کیا جاتے۔

عنایت صاحب نے ان تمام باتوں کو جس سائنسی انداز میں پیش کیا اس کے نتیجہ میں آرٹ سیکشن اخبار کی بنیادی ضرورت بن گیا۔ انگریزی میں جلی یا خفی حروف کے تسے ٹائپ کے نمبر موجود تھے لیکن اردو میں ایسی کوئی سہولت نہ تھی، لیکن عنایت صاحب نے خفی او جلی کتابت کے لئے کتابت کی نبوں کے نمبروں کو امتیاز کا ذریعہ قرار دیا۔ اور آرٹ سیکشن اور نیوز سیکشن کے لئے ایک ایسا آسان ضابطہ کار بنا دیا جس کے مطابق خبر یا مضمون لکھنے والا، سب ایڈیٹر، خوشنویس کو مطلوبہ حد تک خفی یا جلی قلم استعمال کرنے کی ہدایت جاری کر سکتا تھا۔

آرٹ سیکشن کے لئے عنایت صاحب نے شعبہ کتابت سے جن ذہین، مستعد اور فعال کارکنوں کا انتخاب کیا انہیں برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے اخبارات کے نمونے اور میک اپ سے متعلق ضروری کتابیں فراہم کی گئیں۔ اس کے علاوہ انہیں آفسٹ طریقِ طباعت کے مطابق مختلف رنگوں کے استعمال کی تکنیک سے آگاہ کیا گیا۔ سُرخیاں لکھنے کے مختلف مدارج مراتب کرائے گئے اور اس طرح عنایت صاحب نے اخبار کو صوری اعتبار سے اس حد تک جاذبِ نظر بنا دیا کہ ایک خریدار جب سٹال پر رکھے ہوئے اخبارات کو دیکھتے تو اس کا ہاتھ خود بخود خوبصورت ترین اخبار کی جانب بڑھ جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اگر اخبار خبروں اور دوسرے قابلِ مطالعہ مواد کے اعتبار سے بہتر ہو تو پھر قاری کے لئے اس اخبار کو دوسرے اخبارات پر ترجیح دینے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔ آرٹ سیکشن کا قیام اس اعتبار سے اردو صحافت کی ترقی کے لئے عنایت صاحب کا ایک گرانقدر کارنامہ ہے کہ کوہستان اور مشرق کے حسنِ طباعت اور حسنِ ادارت

کی وجہ سے جب ان اخبارات کی اشاعت دوسرے اخبارات کے مقابلہ میں تیزی سے بڑھی تو دوسرے اخبارات بھی مجبوراً ان چیزوں کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے اور اس طرح بیشتر اردو اخبارات جاذبِ نظر بن گئے۔ ان کی اشاعت انگریزی اخبارات سے بڑھنے لگی۔ نتیجتاً انگریزی اخبارات نے بھی جو میک اپ کی تمام سہولتوں کے موجود ہونے کے باوجود لگے بندھے انداز کو قبول کئے ہوتے تھے۔ اپنے ٹائپ تبدیل کئے اور خبروں کی پیش کش کے انداز میں تبدیلی پیدا کی۔

مجھے عنایت صاحب کے ان تمام ابتدائی تجربات میں شرکت کا فخر حاصل رہا ہے اور اس دوران میں نے ان سے صحافت کے مختلف شعبوں کی بنیادی تربیت حاصل کی ہیں تو یہ کہوں گا کہ عنایت صاحب کی رفاقت میں کام کرنا بجائے خود تحصیلِ علم کا سب سے بڑا ذریعہ تھا وہ کوئی کتابی یا نظری بات ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے تجویز کردہ ہر اصول اور طریقِ کار کو عملی رنگ میں پیش کرتے تھے اور ظاہر ہے جو اصول یا تجربہ اپنے ہاتھوں سے عمل کی کسوٹی پر پورا اترے وہ بڑی سے بڑی کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ عنایت صاحب کے عملی تجربات میں جس جس کارکن صحافی یا انتظامی عملے کے فرد نے شرکت کی وہ خود ہی پختہ کار ہوگیا اور اس طرح کوہستان کے زمانے میں کارکنوں کی ایک ایسی ٹیم تیار ہوگئی جو اخباری صنعت کے ہر شعبے میں یکسر نئے اور انقلابی تجربات سے بہرہ ور تھی۔ عنایت صاحب نے اگرچہ اپنی ٹیم کے بااعتماد اور باصلاحیت ارکان کو الگ الگ شعبوں میں خصوصی مہارت اور تربیت کے حصول کی ترغیب دی مگر ان کے کام کرنے کا اپنا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ اخبار کی پروڈکشن کے ہر کام میں عملے کے ہر فرد کو شریک کر لیتے تھے حتیٰ کہ ہم عملۂ ادارت کے ارکان اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد اخبار کی اشاعت و طباعت اور فولڈنگ اور فارورڈنگ تک کے تمام مراحل میں ان کے ساتھ شریک ہوجاتے تھے اور اس طرح اپنی اجتماعی کوششوں سے

کسی پہلو یا معاملے میں کوئی جھول نہ آنے دیتے تھے۔ کوہستان کو بام عروج پر پہنچانے کے بعد انہوں نے مشرق کا اجرا کیا اور یہ ان کی صحافتی زندگی کا سب سے بڑا اور چونکا دینے والا کارنامہ ہے۔ ان کے ذہن میں شروع دن سے جس مکمل اخبار کا تصور تھا اسے انہوں نے مشرق کے روپ میں پیش کیا۔ اس کی یومیہ ضخامت بارہ صفحات رکھی گئی اور ہر صفحہ قارئین کے کسی نہ کسی طبقے کی خصوصی دلچسپی اور ضروریات کے لئے وقف کیا گیا۔ خواتین، طالب علموں، مزدوروں، کسانوں، تاجروں اور صنعت کاروں کو روزانہ اخبار میں بھرپور نمائندگی دی گئی اور فیچر نگاری، کالم نگاری اور رپورٹنگ کیلئے نئے اور چونکا دینے والے اسالیب تجویز کئے گئے۔ نتیجتاً مشرق چند ماہ کے اندر اندر اپنے تمام ہم عصر اخبارات سے آگے نکل گیا۔

عنایت صاحب نے صحافت میں جو تجربات کئے ان کی بنیاد بظاہر ان کی ذہنی اُپج اور افتادِ طبع پر تھی۔ مگر حقیقت میں اس کے پیچھے ایک سائنسی اندازِ فکر کارفرما ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی قارئین کی دلچسپی اور پسند ناپسند کے معیار اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے لئے معروف انداز میں سروے نہیں کرائے۔ لیکن وہ اخبار فروشوں، سیاسی سماجی اور مزدور کارکنوں، اور اخبار کے دفتر میں آنے والے افراد سے بات چیت کے ذریعہ ان چیزوں کا ایک جائزہ مرتب کرتے رہتے تھے۔ اسی جائزے کی بنا پر انہوں نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ پاکستان کے اخبارات پانچ سے دس تک افراد پر مشتمل کنبے میں صرف کنبے کے سربراہ کی دلچسپی کا مواد فراہم کرتے ہیں اور اخبارات کا اظہار اور پیش کش کا انداز ایسا ہے جو پاکستان کی تیرہ فیصد خواندہ آبادی میں سے بمشکل پانچ دس فیصد تعلیم یافتہ افراد کو متاثر کر سکتا ہے۔

اس ادراک کی بنا پر عنایت صاحب نے اپنے اخبار میں دو تین بُنیادی تبدیلیاں کیں۔ ایک طرف انہوں نے اخبارات میں شائع ہونے والے مواد کی دلچسپی کے دائرہ کو وسیع کر کے اس میں ایک عام تاجر، دستکار، چھوٹے موٹے دکاندار، معمولی

ملازم پیشہ افراد، خواتین اور بچّوں تک کی دلچسپی کی چیزوں کو شامل کیا۔ دوسری طرف انہوں نے اخبار میں خبروں اور تبصروں کی زبان کے علمی معیار کو کم کر کے اسے سادہ اور عام فہم بنانے پر زور دیا۔ کوہستان اور مشرق دونوں اداروں میں وہ اپنے رفقاء کو بار بار اس بات پر ٹوکتے رہتے تھے کہ وہ اپنی تحریر میں ثقیل الفاظ اور گنجلک عبارت سے پرہیز کریں مضامین اور اداریوں میں مفہوم کی تشریح و توضیح کے لئے اشعار کا سہارا لینے کی انہوں نے تقریباً ممانعت کر دی تھی۔

اس زمانے میں جبکہ دوسرے اخبارات "قسمت علمی و ادبی" کے عنوان سے سنڈے ایڈیشن میں دو چار صفحات شائع کرتے تھے، عنایت صاحب نے اپنے اخبار میں مزدوروں، ملازمت پیشہ افراد، چھوٹے تاجروں اور صنعتکاروں اور گھریلو مسائل کے متعلق فیچر اور مضامین شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد سے سیاست میں جو جمود طاری ہوا تھا اس نے صحافت کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ عنایت صاحب نے اس جمود کو توڑنے کے لئے اخبار کے صفحات میں سماجی سرگرمیوں، عوام کی مشکلات سے متعلق فیچروں اور مراسلات اور گھریلو مسائل کو بہت اہمیّت دی۔ اور اس طرح اردو صحافت میں اشاعت کے اعتبار سے توسیع کی راہ ہموار کی۔ گھسی پٹی راہ پر چلنے والے صحافی عرصہ تک عنایت صاحب کی ان جدّتوں کی مخالفت کرتے رہے۔ اس زمانے میں بعض حضرات نے یہ بحث بھی شروع کر دی کہ صحافت ایک مشن ہے جبکہ عنایت اللہ اسے ایک صنعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مشن اور صنعت کی اس بحث کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۹۵۸ء تک پاکستان کے بیشتر اخبارات گروہی اور جماعتی سیاست سے وابستگی کو ضروری سمجھتے تھے اور ہر اخبار کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا سرکاری یا غیر سرکاری ترجمان بنا ہوا تھا۔ حقیقت یہ

ہے کہ سیاسی معاملات میں غیر جماعتی یا غیر جانبدار صحافت مفقود تھی اور جب مارشل لاء کی بدولت سیاسی پارٹیاں ہی غیر قانونی قرار دے دی گئیں تو اخبارات کا سیاسی کردار بُری طرح مجروح ہوا۔ پارٹی وفاداری کی بنیاد پر خریداری کا مخصوص حلقہ بھی ٹوٹ گیا۔ کوہستان ان دنوں بھی ایک ایسا اخبار تھا جس نے خود کو کسی خاص سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں کیا تھا۔ البتہ وہ ایک سیاسی نقطہ نظر کا حامی ضرور تھا۔ اور یہ نقطہ نظر تھا نظریہ پاکستان کی بنیاد پر پاکستان میں اسلامی، جمہوری اور فلاحی نظام کا فروغ۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد جب سیاسی سرگرمیوں کے جمود کا دور آیا تو جماعتی سیاست سے وابستہ اخبارات کو ایک طرف سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ دُوسری طرف عنایت صاحب کی جدّت پسندی نے کوہستان میں قابل مطالعہ مواد میں جو تنوّع پیدا کیا اس سے کوہستان کی اشاعت بہت تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی عنایت صاحب نے صحافیوں اور دوسرے کارکنوں کے حالات کار کو بہتر بنانا شروع کیا اور ان کے معاوضوں میں مناسب اضافے کئے۔ جس کے نتیجہ میں بعض دُوسرے اخبارات کے کارکن بھی ملازمت کے سلسلے میں کوہستان کی طرف رجوع ہونے لگے۔ ان حالات میں ایسے اخبارات کی طرف سے کوہستان کے خلاف ایک زبان ہونا قدرتی بات تھی جسے صحافت مشن ہے یا صنعت کا نام دیا گیا۔

عنایت صاحب اگرچہ معترضین سے بحث مباحثہ کرنے کے عادی نہ تھے تاہم انہوں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کو مختلف دوستوں کے ذریعہ قارئین تک پہنچایا اور اپنے کارکنوں کو بھی ذاتی طور پر مطمئن کیا۔ انہوں نے بتایا کہ صحافت اپنے فرائض کے اعتبار سے مشن ضرور ہے لیکن یہ اپنی تنظیم اور ڈھانچہ کے اعتبار سے ایک صنعت ہے۔ کوئی اخبار اپنے مشن کو اس وقت تک آگے نہیں بڑھا سکتا جب

تک اس کی معقول اشاعت نہ ہو اور وہ اقتصادی طور پر خود کفیل نہ ہو معقول اشاعت کے لئے اسے اپنے ایڈیٹوریل سیکشن کے علاوہ اپنے انتظامی شعبوں کو بھی بہتر طور پر منظم کرنا ہوگا، طباعت کا بہتر معیار قائم کرنا ہوگا۔ اپنے کاروبار کو اس طرح ترتیب دینا ہوگا کہ وہ مالی طور پر بیرونی سیاسی دباؤ کا مقابلہ کر سکے۔ اس اعتبار سے اخبار کو ہر صنعتی ادارے کی طرح جو کوئی چیز بنا کر فروخت کرتا ہے ایک معیاری نظام اپنانا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آپ دُوسرے صنعتی اداروں کی طرح ایک چیز تیار کرتے ہیں اس کی قیمت مقرر کرتے ہیں اور اس میں آمد و خرچ اور منافع کا پہلو شامل کرتے ہیں تو یہ ایک صنعتی اور تجارتی عمل ہے۔ صحافت کو صرف مشن اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جبکہ آپ اپنے اخبار کو مفت تقسیم کریں اور نفع نقصان کا خیال آپ کے معاملات میں حائل نہ ہو۔

جہاں تک صحافت کے مشن کا تعلق ہے عنایت صاحب نے اپنے رفقا کو کامیابی کے ساتھ یہ باور کرا دیا کہ صحافت کا مشن صرف یہ نہیں کہ کسی برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومت کو ہٹا کر کسی دُوسری پارٹی کی حکومت کے قیام کے لئے کام کیا جائے بلکہ صحافت کا مشن معاشرے میں آزادیٔ فکر و عمل کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنا، جمہوری اقدار کو فروغ دینا، لوگوں میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنا، معاشرے کو بدعنوان اور مفاد پرست لوگوں کے ہتھکنڈوں سے نجات دلانا اور ان میں بلیک میلروں اور دھوکہ بازوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اس مشن کی تکمیل نعرے بازی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے اخبارات کو اپنے قارئین کے ذریعہ پورے معاشرے کی تعلیم اور تربیت کرنی چاہیئے۔ اس مشن کی تکمیل کا یہی ایک راستہ نہیں کہ اخبارات اور صحافی بھی اپنی اپنی پسند کی کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہو کر سیاسی محاذ آرائی میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے

برعکس صحافیوں کو معاشرتی اور سیاسی خرابیوں کے انسداد اور مثبت اقدار کے نفاذ کے لئے ہمہ پہلو جہاد کرنا چاہیئے اور اس کے لئے جتنی بھی نئی راہیں ممکن ہوں تلاش کرنی چاہیئں۔

عنایت صاحب نے اخبار کے لئے جو نئی راہیں تلاش کیں ان میں ایک ریڈرز سروس بھی ہے جو مشرق کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ عنایت صاحب کہا کرتے تھے کہ اخبارات معاشرہ میں بہت بڑی طاقت ہوتے ہیں اور یہ طاقت رائے عامہ کی تربیت اور رہنمائی کے علاوہ قارئین کی عملی امداد کے لئے بھی استعمال ہونی چاہیئے۔ وہ کہتے تھے کہ لوگوں میں نیکی کا جذبہ موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ لوگوں کو نیکی پر ابھارا جائے تاکہ ضرورتمند لوگوں کی مدد کی جا سکے۔ یہ کام صرف وہی اخبار کر سکتا ہے جس پر اس کے قارئین اعتماد رکھتے ہوں۔ اس بنیاد پر انہوں نے مشرق ریڈرز سروس کا آغاز کیا۔ اس سے قبل اخبارات میں عموماً گمشدہ اشیاء کے بارے میں اعلانات شائع ہوتے تھے۔

عنایت صاحب نے محسوس کیا کہ ہمارے معاشرے میں گمشدہ اشیاء کے وصول کرنے اور پھر انہیں متعلقہ افراد تک پہنچانے کا ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے عوام کو کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنے رفقا سے مشورہ کیا کہ اخبار اس کمی کو پورا کرنے میں کس حد تک مدد کر سکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی عنایت صاحب کی دردمند طبیعت نے خدمتِ خلق کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں کو اپنے اس تجربہ کے دائرہ میں شامل کر لیا۔

انہوں نے مشرق ریڈرز سروس کے نام سے اخبار میں ایک علیحدہ کالم جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کالم میں شائع ہونے والے مندرجات کی عنایت صاحب عرصہ تک براہِ راست نگرانی کرتے رہے۔ اور اس کے دائرہ عمل کو انہوں نے اتنی وسعت دی کہ مشرق کا یہ کالم ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس شعبہ کی نگرانی کے لئے ادارہ کے ایک سینئر رکن کو مامور کیا گیا، جس نے ہزاروں بیواؤں،

یتیموں اور نادار لوگوں کو ایسے مخیّر حضرات سے متعارف کرایا جو ضرورت مندوں کی امداد کے خواہاں تھے، لیکن انہیں امداد کے لئے صحیح افراد کا انتخاب کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ریڈرز سروس نے تقسیم ہند کے وقت بچھڑ جانے والے سینکڑوں بچوں اور بچیوں کو اُن کے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملایا۔ گھروں سے بھاگی ہُوئی سینکڑوں نوجوان لڑکیوں کو جو گھریلو حالات یا فلموں میں کام کرنے کے شوق میں خاندانی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا دیتی تھیں آبرومندانہ طور پر محفوظ مقامات پر پہنچایا اور والدین کے حوالے کیا۔ افراد کا گمشدہ سامان جس میں سائیکل کی چابی سے لے کر شادی بیاہ کے زیورات اور کپڑوں سے بھرے ہُوئے بکس تک شامل ہیں، مالکوں کو پہنچائے گئے۔ مشرق ریڈرز سروس کی بدولت نیک نیّت تانگے والوں، رکشا اور ٹیکسی ڈرائیوروں کے لئے یہ کام آسان ہو گیا۔ کوئی سواری اُن کے تانگہ یا ٹیکسی سے اترتے وقت جو سامان بھول جاتی ہے اُسے کس طرح مالک کے حوالے کیا جائے۔ ریڈرز سروس کے ذریعہ ہزاروں نادار طلبا کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے کتابیں اور وظائف حاصل ہُوئے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرق ریڈرز سروس کے ذریعہ عنایت صاحب نے قومی دفاع کے لئے پیسہ ٹینک سکیم شروع کی اور عوام کو احساس دلایا کہ اگر ہر شخص روزانہ ایک پیسہ بھی دفاعی ضروریات کے لئے حکومت کو پیش کرے تو اس رقم سے ایک ٹینک، ایک طیّارہ اور ایک توپ خریدی جا سکتی ہے۔ یہ سکیم عوام میں اتنی مقبول ہُوئی کہ نہ صرف لاہور بلکہ مشرق کے دائرہ اشاعت میں واقع ہر شہر اور قصبہ میں پیسہ ٹینک سکیم کے تحت عطیات جمع کئے گئے اور جب حکومت نے دفاعی فنڈ جمع کرنے کا اعلان کیا تو مشرق کی اس سکیم کے تشہیری نمونہ کو فنڈ کی تشہیر کا سمبل بنایا گیا دفاعی فنڈ کی سکیم کے ساتھ مشرق ریڈرز سروس نے محاذ پر خدمات انجام دینے والے

فوجی بھائیوں کے لئے ایسی ضروری اشیاء کی فراہمی کی اپیل کی جو ان کے راشن یاسامان کی لسٹ میں شامل نہیں ہوتیں۔ ان میں قرآن کریم کے نسخے، ٹرانسسٹر ریڈیو، اونی سوئٹر، کنگھے تولیے، صابن اور ڈاک کے لفافوں سے لے کر نسوار اور سگریٹ تک مختلف اشیاء شامل تھیں۔ مشرق ریڈرز سروس نے ان اشیاء کو وصول کرنے اور انہیں فوج کے متعلقہ شعبوں تک پہنچانے کی پیش کش کی تھی۔ عوام نے اس مہم میں اتنے جوش وخروش سے حصہ لیا کہ مشرق کے دفتر میں ان اشیاء کے انبار لگ گئے۔ دفتر کے باہر اس مقصد کے لئے ایک بہت بڑا کیمپ قائم کرنا پڑا۔ اس کے بعد جنگ سے متاثرہ سرحدی علاقوں سے لُٹے پٹے اور بے گھر افراد کے قافلے آنے شروع ہو گئے تو ریڈرز سروس نے ان کی فوری امداد کے لئے کھانے پینے کی اشیاء، کپڑوں، لحاف اور بستروں اور برتنوں کے عطیات کی اپیل کی اور ہزاروں افراد کو ریڈرز سروس کے کیمپ سے یہ اشیاء فراہم کی گئیں۔

ہسپتالوں میں زیر علاج جاں بلب مریضوں اور جنگ کے دوران فوجی بھائیوں کے لئے خون کے عطیات جمع کرنے کی مہم بھی مشرق ریڈرز سروس کا طرّۂ امتیاز رہی ہے جنگ سے قبل ریڈ کراس کی بلڈ ڈونر سروس کے تعاون سے ریڈرز سروس نے عوام میں خون کے عطیات دینے کی تحریک کو فروغ دیا اور جنگ کے دوران جب عطیات خُون کی اپیل کی گئی تو عوام نے اتنے جوش وخروش سے اس اپیل پر لبیک کہا کہ بلڈ ڈونر سروس کے پاس خُون کے عطیات کو محفوظ کرنے کا انتظام ناکافی ہو گیا۔ اسی طرح مریضوں کو ہسپتالوں میں داخل کرانے، نادار مریضوں کے لئے مخیّر حضرات سے قیمتی دوائیں حاصل کرنے کے سلسلے میں مشرق ریڈرز سروس نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ عنایت صاحب کی خواہش تھی کہ

مشرق ریڈرز سروس کے لئے ایمبولینس گاڑیاں خریدی جائیں جو زخمیوں اور مریضوں کی "فری سروس" کریں اور اُنہیں ضرورت کے وقت ہسپتالوں تک پہنچائیں۔

مشرق ریڈرز سروس کا دائرہ کار عنایت صاحب کے تصوّرات کے اعتبار سے غیر محدود تھا۔ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ اخبار میں اس نوعیت کا کالم اور مخصوص شعبہ فی الواقع معاشرہ کی خدمت کا ایک عظیم ذریعہ ہے۔ مشرق کے کارکن اس بات پر ہمیشہ فخر کرتے ہیں کہ عنایت صاحب کی جدّت پسند، درد مند طبیعت اور ذہنِ رسا کی بدولت انہیں ایک ایسے اخبار میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ جس نے صحافت کے مشن ہونے کے نظریہ کو عملی طور پر اختیار کیا۔ البتہ فرق صرف یہ تھا اور رہے ہے کہ مشرق کا مشن کسی فرد یا افراد کے ذاتی سیاسی نظریات کی فروغ کا مشن نہیں بلکہ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں عوام کی خدمت کا مشن ہے۔ مشرق کا مشن بعض دوسرے اخبارات کی طرح مالکوں کے لئے بلڈنگوں کی تعمیر اور اثاثوں کی تشکیل کی بجائے قارئین اور عوام کی ضروریات کی تکمیل اور معاشرہ میں خدمتِ خلق کی نئی راہیں پیدا کرنے کا مشن ہے۔

عوام کے مسائل سے اخبار کو اس حد تک وابستہ کرنے کا تصوّر عنایت صاحب کے نظریہ صحافت کا بنیادی جزو تھا اور عنایت صاحب کے جاری کردہ اخبارات اور بالخصوص مشرق نے ہر مرحلے پر ان کے اس نظریہ کی صداقت کا عملی ثبوت پیش کیا۔ یہی سبب تھا کہ مشرق کے اجرا کے بعد تین ماہ کے اندر اس کی اشاعت لاہور سے شائع ہونے والے اردو اخبارات میں سب سے زیادہ ہوگئی۔ سال کے اندر یہ اس علاقے کا سب سے بڑا اخبار بن گیا۔ اس عرصہ میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات کی طرح نیشنل پریس ٹرسٹ نے مشرق کی ملکیت بھی حاصل کر لی تو ہر حلقے میں یہ تاثر دیا گیا کہ مشرق اب اپنی مقبولیت برقرار نہ رکھ سکے گا اور ٹرسٹ کی ملکیت میں آنے کے بعد ایک اچھا اخبار جو سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر ایک آزاد انداز فکر رکھتا تھا ختم ہو جائے گا لیکن مشرق نے زندگی کے مختلف شعبوں میں عوام کے مسائل کو جس مؤثر انداز میں پیش کیا اس سے ثابت ہو گیا کہ صحافی کا مشن

ایک محدود دائرے میں گروہی سیاست کی پیروی نہیں بلکہ قومی زندگی کے وسیع میدان میں عوام کی خدمت اور ان کے سیاسی اور سماجی شعور کی تربیت ہے اور اگر شعوری طور پر کام کیا جائے تو اخبارات ہر قسم کے ماحول میں اپنے مشن کو جاری رکھنے کی راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اردو اخبارات میں آج صوری اور معنوی اعتبار سے جتنی خوبیاں نظر آتی ہیں اور اخبار کی تیاری کا جو تنظیمی ڈھانچہ تشکیل پا چکا ہے اس کے پیچھے اس عظیم شخصیت کا ذہن کارفرما ہے۔ انہوں نے روزانہ صحافت کے علاوہ مجلاتی صحافت میں بھی نئے تجربات کئے۔ لندن سے ہفتہ وار مشرق اور اخبارِ وطن اور کراچی سے اخبارِ خواتین کا اجرا بھی ان کے یادگار کارناموں میں شمار ہوتا ہے اور اگر زندگی وفا کرتی تو ابھی ان کے ذہن میں روزانہ اور مجلاتی صحافت کی توسیع و ترقی کے کئی منصوبے تھے اور اپنی علالت کے دوران بھی وہ اپنے ان توسیعی منصوبوں پر مجھ سے بارہا تبادلہ خیال کیا کرتے تھے

مجھے عنایت صاحب کے کردار کے جس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی طبیعت کی درویشی تھی وہ ایک مردِ باکمال اور عزت و ثروت کے بلند ترین مدارج پر فائز ہونے کے باوجود حد درجہ منکسر تھے اور ذاتی منفعت کے تو احساس سے ہی بے نیاز تھے۔ انہوں نے خرابوں میں جنتیں تعمیر کر دیں۔ مگر اپنے لئے ایک پیسے کا بھی لالچ نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے بیش قیمت املاک تعمیر کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنے پسماندگان کے لئے کوئی میراث نہیں چھوڑی وہ حد درجہ غنی اور مستغنی تھے اور صرف محنت کی عظمت پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے صرف محنت اور صلاحیت کے بل پر کروڑوں روپے کی مالیت کے اخباری ادارے قائم کئے۔ مگر اس محنت کا سارا صلہ اپنے کارکنوں کو ہی لوٹا دیا وہ اخباری صنعت کی پہلی شخصیت تھے۔ جس نے اخبار کی آمدنی کو صرف اخبار

کی توسیع اور کارکنوں کی خوشحالی کے لیے وقف کر دینے کی نظیر قائم کی۔

کوہستان کے زمانے میں ابھی صرف پریس کمیشن کی سفارشات منظرِ عام پر آئی تھیں اور ان سفارشات کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی (یہ پہلے ویج بورڈ کے تقرر سے بھی پہلے کی بات ہے) کہ عنایت صاحب نے اس وقت تمام کارکنوں کی تنخواہیں ان سفارشات کے مطابق کر دیں۔ حالانکہ اس وقت تک کوہستان کے مالی وسائل اس زائد خرچ کے متحمل نہیں تھے۔ مگر عنایت صاحب نے اس کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ مطمئن اور خوشحال کارکن ہی کسی ادارے کی سب سے بڑی دولت ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ان آسودہ خاطر کارکنوں کی محنت رنگ لائی اور اخبار کی مالیات میں بھی بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اس کے بعد جب ویج بورڈ کے ایوارڈ کا اعلان ہوا تو اس کا اطلاق بھی سب سے پہلے کوہستان کے کارکنوں پر ہی ہوا بلکہ انہوں نے زیادہ باصلاحیت کارکنوں کو ان کے استحقاق سے بھی زیادہ مشاہرے دے دیئے۔ ویج بورڈ کے ایوارڈ کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ یہ تو حکومت کی طرف سے کم سے کم مقرر کردہ اُجرتیں ہیں جبکہ اچھی انتظامیہ کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے کارکنوں کو زیادہ سے زیادہ اجرتیں دے۔ یہی وجہ ہے کہ عنایت صاحب نے جتنے بھی اخباری ادارے قائم کئے ان سب میں انہوں نے ہر باصلاحیت کارکن کو دوسرے اداروں سے کہیں بڑھ کر مراعات دیں۔ اخباری صنعت کے کارکنوں نے جب ملک بھر میں عبوری امداد کے مطالبے کا آغاز کیا تو عنایت صاحب نے کسی حیل و حجت کے بغیر ہی مشرق کے کارکنوں کو عبوری امداد دے دی۔ حالانکہ اسی مطالبے کو منوانے کے لئے دوسرے اخباری اداروں کے کارکنوں کو طویل جدوجہد کرنی پڑی۔

وہ صحافیوں کو خوشحال دیکھنے کے متمنّی تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ ان کی استعداد اور تربیت کا معیار بلند کرنے کے لئے بھی مضطرب رہتے تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ملازمت کا تحفظ

استعداد کو قربان کر کے حاصل کرنا درست نہیں بلکہ کارکنوں کو ان کی محنت، لیاقت اور کارکردگی کی بنیاد پر بہتر معاوضے اور معقول سہولتیں ملنی چاہئیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ صحافیوں کی انجمنیں سکول آف جرنلزم کھولیں جہاں رپورٹروں اور سب ایڈیٹروں کو پیشہ ورانہ تربیت دی جائے۔ اور انہیں حالاتِ حاضرہ اور ان کے پس منظر سے روشناس کرایا جائے۔ وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ صحافیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ اخبارات و جرائد کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ وسیع مطالعہ ہی واقعات و مسائل کے ہر پہلو سے آگاہ رکھتا ہے۔

عنایت صاحب اس پہلو پر اتنا زور دیتے تھے کہ انہوں نے صحافیوں کی یونین کے لیڈروں سے ملاقاتوں میں ہمیشہ یہ تجویز پیش کی کہ یونین کو صحافیوں کی تربیت کے لئے اپنا نظام قائم کرنا چاہیئے اور اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے صحافیوں کے لئے انعامات اور اعزاز کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ ابھی تک کوئی تنظیم مرحوم کی اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکی۔

بیرونی سطح پر اگرچہ صحافیوں کی تربیت کا نظام قائم نہ ہو سکا۔ لیکن عنایت صاحب نے مشرق کے آغاز کے موقع پر اپنے اطمینان کی حد تک اس کا اہتمام ضرور کر لیا تھا۔ مشرق کی اشاعت ۱۷ ستمبر ۱۹۶۳ء سے شروع ہوئی جبکہ جولائی کے مہینہ سے انہوں نے کارکنوں کی ٹیم کو ایک باقاعدہ دفتری نظام کا پابند کر دیا تھا۔ جہاں بیشتر صحافی اور دوسرے کارکن وقت سے آتے تھے اور پورا دن صرف کرتے تھے۔ عنایت صاحب صحافت کے مختلف شعبوں سے متعلق کتابیں ان میں تقسیم کرتے اور ہر کارکن سے کتاب کے مطالعہ کے بعد اس کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے۔ انہوں نے ایک اچھے اخبار کے لئے ایک سٹائل بک تیار کی جس کا ہر کارکن کو مطالعہ کرایا گیا۔ اس میں صحافیوں کے لئے وضاحت کے ساتھ DOES اور DONTS

کا اندراج تھا یعنی اخبار میں کیا کام کرنے اور کیا چیزیں شائع کرنی چاہئیں اور کیا چیزیں اور کیا کام ممنوعات میں شامل ہیں۔ اخبار کے متنوّع مواد کے بارے میں اپنے نظریات کے مطابق خبروں اور فیچروں کے لئے انہوں نے فرداً فرداً ہر کارکن کو ہدایات دیں اور اخبار کی عدم موجودگی میں بھی ان کارکنوں سے باقاعدہ اشاعتی مواد تیار کروا کر اسے فائلوں میں رکھواتے رہے۔ دو ڈھائی ماہ کی اس تربیت کے دوران ہی انہوں نے بیشتر کارکنوں کے لئے اخبار میں فرائض منصبی کے اعتبار سے صحیح پوزیشن کا تعین کیا۔ کارکنوں کی جس طرح تربیت کی گئی تھی اس پر عنایت صاحب کو اتنا اعتماد تھا کہ اخبار کی اشاعت کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ صحافت کی مسلّمہ روایت کے مطابق ایک دو روز تک انتظامات کے بارے میں اطمینان کرنے کے لئے ڈمی (نمونے کا اخبار) تیار کی جائے تو عنایت صاحب نے اس روایت سے گریز کا فیصلہ کیا اور کہا کہ ہم براہِ راست اشاعت کے لئے اخبار تیار کریں گے۔

جب اخبار جاری ہو گیا تو انہوں نے کسی حد تک تربیت دوران کار کا اہتمام اس طرح برقرار رکھا کہ وہ آٹھ دس یا پندرہ دن تک کسی خاص کارکن کی کارکردگی پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی تمام توجہ اس کی تیار کردہ خبروں اور فیچروں یا دوسری کارکردگی پر مرکوز رہتی تھی۔ وہ ہر روز اس کارکن سے اس کی کارکردگی پر بحث کرتے تھے اور اس طرح ایک مسلسل عمل کے طور پر اپنے ادارے کے کارکنوں اور رفقاء کار کی صلاحیت اور استعداد کار کو بڑھانے میں مصروف نظر آتے تھے۔ اس ضمن میں وہ برطانوی صحافت کی ممتاز شخصیت لارڈ آسٹر کا یہ مقولہ پیش کرتے تھے:

There is no standing still in newspaper. They either progress or die.

"اخبارات کے لئے کسی سطح پر پہنچ کر ٹھہر جانا ممکن نہیں۔ اگر وہ مسلسل ترقی کی راہ پر بڑھتے

نہ رہیں تو ختم ہو جائیں گے۔"

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران جب اخبارات کی ضخامت کاغذ کی قلت کی وجہ سے محدود ہو گئی اور مشرق بھی بارہ صفحات کی بجائے صرف چار صفحات پر شائع ہونے لگا تو عنایت صاحب نے کم سے کم جگہ کو بہتر سے بہتر طور پر استعمال کرنے کے نقطہ نظر سے اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کی تحریروں میں اختصار، انتہائی ضروری مواد کا انتخاب، کتابت اور طباعت کے طریقوں میں اپنی نقطہ نظر سے ضروری تبدیلیاں اور ایسے ہی دوسرے مسائل پر عنایت صاحب نے اتنی محنت کی کہ صفحات کی تعداد ایک تہائی رہ جانے کے باوجود مستقل کالموں اور روزانہ خبروں کے اعتبار سے اخبار پہلے کی طرح مکمل اخبار نظر آتا تھا اور اخبار میں قابلِ اشاعت مواد کی جگہ کم ہو جانے کے باوجود کارکنوں کی پوری تعداد کی صلاحیتوں کو بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

سچّی بات یہ ہے کہ آج صحافت کے پیشے کو جو عزت و توقیر حاصل ہے وہ عنایت صاحب ہی کی عطا کردہ ہے وہ صحیح معنوں میں محنت کی عظمت کے قائل تھے اور سرمائے کو محنت ہی کی تخلیق سمجھتے تھے۔ اس لئے سرمائے پر محنت کشوں کا حق سب سے فائق سمجھتے تھے۔ صحافت کی اخلاقیات کے بارے میں بھی ان کے تصورات بڑے ارفع تھے۔ ان کے نزدیک معلومات کی غلطی یا سچائی کا اخفا کسی صحافی کا سب سے بڑا گناہ تھا۔ اس لئے وہ خبروں اور معلومات کی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ہر کارکن کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ عنایت صاحب کارکنوں میں جن خوبیوں کو اولیت دیتے تھے وہ محنت، وفاداری اور دیانت تھیں۔ عنایت صاحب کہا کرتے تھے کہ انسان کی تمام خامیاں محنت سے پوری ہو سکتی ہیں۔ لیکن محنت کی کمی بڑے سے بڑے سرمائے سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح ان کا قول تھا کہ دیانت دار آدمی خواہ اپنے کام پر پورا عبور نہ بھی رکھتا ہو وہ ادارے کے لئے

مفید بن سکتا ہے۔ لیکن بددیانت آدمی خواہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو، ہر صورت میں ادارے کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ عنایت صاحب کہا کرتے تھے کہ وفادار کارکن کسی ادارے کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتا ہے اور اجتماعی مفاد کے مقابلے میں اس کے ذاتی مفاد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ وفاداری کو شرطِ ایمان سمجھتے تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ خوئے وفا سب خوبیوں سے افضل ہے اور جو کارکن اپنے ادارے کا وفادار نہیں، وہ اپنے ساتھیوں، دوستوں، بیوی بچوں اور ملک و قوم کا بھی وفادار نہیں ہو سکتا۔

صحافت کی آزادی بھی انہیں دل و جان سے زیادہ عزیز تھی اور وہ اس ملک میں مثالی جمہوریت کے فروغ اور فلاحی مملکت کے قیام کی آرزو رکھتے تھے۔ ان کی بے وقت موت سے ان کے بہت سے خواب ادھورے رہ گئے ہیں مگر صحافت میں ترقی کی جو رفتار وہ قائم کر گئے ہیں وہ ہمیشہ جاری رہے گی اور مستقبل کے ہر اخبار پر ان کا سایہ باقی رہے گا۔

جمیل الزماں

ابتدائے عشق

یہ اوائل ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب میں نیا نیا سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شامل ہوا تھا۔ ان دنوں باری علیگ اور عبداللہ بٹ برٹش انفارمیشن سروس میں ملازم تھے اور ہم تینوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک روز میں ریس کورس روڈ پر برطانوی ہائی کمیشن کے دفترِ اطلاعات میں ونگ کمانڈر اے ای سمتھ (علاقائی افسرِ اطلاعات برٹش انفارمیشن سروس لاہور) سے مل کر باہر نکلا تو وہاں عبداللہ بٹ نے میرا تعارف ایک مجھ جیسے دُبلے پتلے نوجوان سے جو دیدہ زیب برطانوی رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا یہ کہہ کر کرایا "ناجو سے ملئے۔ عنایت اللہ ناجو پاکستانی لڑکے لڑکیوں کے پندرہ روزہ رسالہ ہدایت کے ایڈیٹر" میں مسکرایا۔ ہاتھ ملایا اور میں نے کہا "جمیل الزمان"۔ عبداللہ بٹ بولے "چیف رپورٹر، سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔ ناجو معنی خیز انداز میں مسکرائے، خاموش رہے اور برطانوی رسائل کی تنقیدی ورق گردانی میں دبی دبی کھانسی کھانستے پھر سے مصروف ہو گئے۔ میں نے پوچھا "اِدھر کس طرح آنا ہوا؟" تو پھر خاموشی سے مسکرا دئے۔ میں نے سوچا یہ تو کم گو اور کم آمیز قسم کے نوجوان معلوم ہوتے ہیں بالکل غیر عبداللہ بٹ

ٹائپ! اتنے میں ونگ کمانڈر سمتھ نے عنایت اللہ کو اندر بلوا لیا تو عبداللہ بٹ نے بتایا کہ اپنے رسالے کے آزادی نمبر ۱۹۴۸ء کے لئے پیغام لینے آتے ہیں اور چونکہ میں خود "ہدایت" کا پُرانا مدیر ہوں اور یہ اسلامیہ کالج لاہور کے اولڈ بوائے بھی ہیں اس لئے یہ پیغام بھی اردو میں ونگ کمانڈر سمتھ کو میں نے ہی لکھ کر دیا ہے اور انہیں اسے شائع کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ میں نے کہا یہ حضرت تو کوئی پُراسرار شخصیت معلوم دیتے ہیں۔ عبداللہ بٹ ہنسا اور بولا بھئی یہ صاحب کتاب آدمی ہے اس کی کتاب "پہاڑ کی کہانی" میں نے پہلے ہدایت میں ۴۵-۱۹۴۴ء میں بالاقساط چھاپی اور پھر قومی کتب خانے نے اسے شائع کیا۔ وہ بات یاد ہے چراغ حسن حسرت والی

And Sir, I have shown you
the real INDIA today :

یہی بات "ناجو" کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ

I have shown you a real artist-Editor today.

اور ہم دونوں حسبِ معمول ہنس دیئے۔

اس تعارف کے بعد میں نے کئی مرتبہ عرب ہوٹل میں عنایت اللہ ناجو کو دیکھا کہ وہ چراغ حسن حسرت اور الیف کے خان درانی مدیر ہفت روزہ "ٹروتھ" کی باتیں بہت ادب اور غور سے سنتے، دبی دبی کھانسی کھانستے اور منہ سے ایک لفظ نہ نکالتے۔ چراغ حسن حسرت کا مرغوب موضوع "امروز" کا گٹ اپ ہوتا اور فضل کریم خان درانی اپنے بیرونی تبلیغی دوروں اور علامہ اقبال سے اپنی علمی اور دینی تحریروں پر حوصلہ افزائی کے قصے سنایا کرتے تھے۔ عبدالمجید سالک کا "انقلاب" کے اختتامی دور پر تبصرہ کہ "میاں! اب تو وہ اخبار بکے گا جو باتصویر ہوگا" عنایت اللہ ناجو نے پلے باندھ لیا تھا۔ یوں بھی ہدایت کی ادارت کے دنوں عنایت اللہ اور

آرٹ ایڈیٹر حفیظ سرور کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک کے ہدایت کے شمارے ان کے انداز اشاعت و طباعت کے غماز ہیں۔ ہدایت کے جنوری ۱۹۵۰ء کے سالگرہ نمبر میں محمد احسن ناشر نے لکھا "آج بارہ برس گزر گئے جب میں نے ہدایت جاری کیا۔ یہ بارہ برس آنکھ جھپکنے میں گزر گئے..... جب میں نے کام شروع کیا تو طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں لیکن ناجو صاحب ایڈیٹر ہدایت خوبی کے آدمی ہیں انہوں نے ایسی ترکیبیں نکالیں کہ کام آسان ہوتے چلے گئے انہیں تو گویا کام کا جنون ہے۔ کام سے ہر وقت چمٹے رہتے ہیں - پھر حفیظ سرور آئے۔ یہ ہدایت کے آرٹ ایڈیٹر ہیں۔ دیکھتے کیسی رنگا رنگ کی تصویریں بناتے ہیں۔ یہ بیل بوٹے جو تم ہدایت میں دیکھتے ہو وہی تو بناتے ہیں۔ ایک ٹیم دن رات کام کر کے تمہیں رسالہ پیش کرتی ہے۔ کیا بتائیں کام کا کیسا شوق ہے۔ خدا کرے ہم اس قابل ہو جائیں کہ اس میں اور خوبیاں پیدا کریں"۔ یہ ہدایت کے اس دور کی تحریر ہے جب عنایت اللہ روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی کی آبیاری میں مصروف ہو چکے تھے۔ اسی سالگرہ نمبر کے آخر میں "بڑوں کا صفحہ" پر یہ اعلان شائع ہوا کہ

روزنامہ تعمیر کی چند خصوصیات

ہدایت کے پچھلے پرچوں میں آپ یہ خبر پڑھ چکے ہوں گے کہ ادارہ ہدایت نے راولپنڈی سے ایک روزانہ اخبار نکالنا شروع کیا ہے جس کا نام "تعمیر" ہے۔

اگر آپ کو روزنامہ تعمیر کا کوئی شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ خود ہی اس نئے روزنامے کی ادبی خوبیوں اور سیاسی مسلک کے معترف ہو گئے ہوں گے لیکن اگر اتفاق سے ابھی تک تعمیر آپ کی توجہ سے محروم رہا ہے تو آپ

کی اطلاع کے لئے ہم چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آزاد کشمیر، صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب کے اضلاع راولپنڈی، جہلم اور گجرات وغیرہ میں کوئی ایسا اخبار نہ تھا جو ان علاقوں کے باشندوں کو ملکی اور غیر ملکی خبریں بروقت پہنچا سکتا۔ لاہور کے اخبار عموماً سولہ سترہ گھنٹے بعد پہنچتے تھے۔ تعمیر نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

اردو اخبار آپس کی لاگ ڈانٹ اور پارٹی بازی کی وجہ سے ملکی مسائل کو ایسے رنگ میں پیش کرنے کے عادی تھے کہ پڑھنے والوں کو ان کی تحریروں سے بہت کم فائدہ پہنچتا تھا۔ تعمیر ان تمام جھگڑوں سے بالاتر ہے۔

یہ عام شکایت تھی کہ انگریزی اخباروں کی طرح اردو اخبارات کی ترتیب، لکھائی، چھپائی اور خبریں حاصل کرنے کا انتظام معقول نہیں ہوتا۔ تعمیر دیکھ کر آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی یہ شکایت بہت حد تک کم ہوگئی ہے۔

مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ تعمیر کی ایک بڑی خوبی سیاست اور ادب پر حاوی ادیبوں اور اخبار نویسوں کی اس کے عملے میں شرکت ہے۔ نسیم حجازی اور عنایت اللہ (ناجو) ایڈیٹر ہدایت جیسے ادیب تعمیر کی پالیسی کے نگران ہیں۔ ہماری مخلصانہ رائے ہے کہ تعمیر کی سرپرستی فرما کر آپ پاکستان کے مستقبل کو شاندار بنانے میں حصہ لیں گے۔

"قادر منزل سید پوری روڈ راولپنڈی یا لاہور آفس ۶۵ ریلوے روڈ کے پتے پر خط لکھ کر تعمیر جاری کرنے کا آرڈر دیجئے۔

منیجر ہدایت لاہور

اگرچہ وہ عطا اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کے رسیا تھے اور چوہدری افضل حق،

ابوالکلام آزاد اور محمد حسین آزاد کی تحریروں کے شیدائی لیکن عنایت اللہ ناجو جتنے کم گو تھے اتنا ہی کم لکھتے تھے۔ پُرانے فائل گواہ ہیں کہ انہوں نے لکھا کم اور لکھوایا زیادہ۔ ہدایت کے یکم اور آٹھ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے شمارے میں اوّلین صفحے پر "آپس کی باتیں" کے زیرِ عنوان ناجو نے لکھا:۔

اچھے بچّو! یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ ہدایت اب کتنی ترقی کر گیا ہے۔ پہلے یہ اخبار ی کاغذ پر چھپتا تھا۔ اب سفید چکنے کاغذ پر چھپتا ہے۔ تصویریں بھی پہلے کی نسبت بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ یہ ترقی صرف ہماری محنت کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ آپ کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ اگر آپ ہمارا حوصلہ نہ بڑھاتے اور قدم قدم پر ہماری پیٹھ نہ ٹھونکتے تو ہم اس مقام پر کبھی نہ پہنچتے۔ اب یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری ترقی رک گئی ہے اور ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری منزل ابھی بہت دُور ہے۔ یہ تو راستے کے چھوٹے چھوٹے پڑاؤ ہیں۔ ہم پہلے پڑاؤ پر پہنچ چکے اب آگے بڑھنے کے لئے پھر آپ کی مدد کی ضرورت آپڑی ہے۔ ہمارا سفر ایسا ہے کہ روپیہ پیسہ کے بغیر طے نہیں ہوسکتا اور روپیہ پیسہ آپ ہی مہیّا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ میں سے ہر ایک ہدایت کے پانچ نئے خریدار بنادے تو یہ مشکل بہت جلد حل ہوسکتی ہے۔ "ناجو"

وسط نومبر کے شمارے میں" اخبارات کی مانگ" کے عنوان سے مندرجہ ذیل معلومات بچّوں کو پہنچائی گئیں جو عنایت اللہ کے لاشعوری احتجاج کی غمازی کرتی ہیں۔

"ایک وقت تھا جب اخبارات کے مالک سوچا کرتے تھے کہ ریڈیو کی ایجاد سے ان کے اخبارات کی مانگ کم ہوجائے گی۔ لیکن اصل میں ایسا نہیں ہوا جب سے ریڈیو ایجاد ہوا ہے اخبارات کی مانگ پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ اس

زیادتی کی دو تین وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ریڈیو کی خبریں بہت مختصر ہوتی ہیں۔ انہیں سُن کر لوگوں کا شوق پورا نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اخبار خرید کر پڑھتے ہیں۔ بی بی سی لندن سے جو خبریں سناتی جاتی ہیں وہ قریب اٹھارہ سو الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن یہی خبریں اخبارات میں ایک لاکھ لفظوں میں چھپتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ کی وجہ سے لوگوں کی آمدنی بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے جو آدمی ایک اخبار خریدا کرتا تھا اب تین چار اخبار خریدتا ہے۔

دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان کے اخبارات بہت تھوڑی تعداد میں چھپتے ہیں۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے جب یہاں کے اخبارات بھی ہزاروں کی بجائے لاکھوں کی تعداد میں چھپا کریں۔

انگلستان کے دو چار اخبارات کی اشاعت دیکھئے۔

نیوز آف دی ورلڈ ۶۰ لاکھ، ڈیلی ایکسپریس ۴۰ لاکھ، ڈیلی ٹیلیگراف ۱۰ لاکھ"

عنایت اللہ ابتداء ہی سے ذاتی نمود و نمائش کے قائل نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے ہدایت پر مستقل ایڈیٹر کا نام ناجو ہی شائع کرایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کے پُرزور اصرار پر انہیں ہدایت کے ۸ رجنوری ۱۹۴۷ء کے سالگرہ نمبر میں اپنی شبیہہ کا سکیچ چھپوانا پڑا۔ اور اس میں آپس کی باتیں کے صفحے پر انہوں نے اپنے قلمی نام ناجو سے لکھا۔

"اچھے بچّو! یہ پرچہ جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہدایت کا سالنامہ بھی ہے اور سالگرہ نمبر بھی۔ "ہدایت" کو جاری ہوئے پورے نو سال ہو گئے۔ اب دسواں سال شروع ہوتا ہے۔ یہ نمبر اس کی سالگرہ کی خوشی میں شائع کیا گیا ہے۔ ہدایت ہم سب کا چہیتا ہے۔ اس لئے اس موقع پر جتنی بھی خوشی مناتے اور دھوم دھام کرتے تھوڑی تھی لیکن سمے مہنگا ہے اور کرتے دھرتے کچھ بن نہیں پڑتی۔ پھر بھی ہم نے اپنی طاقت

سے بڑھ کر کام کیا ہے اور اس کا ایسا بناؤ سنگار کیا ہے کہ جو بھی دیکھے گا عش عش کر اُٹھے گا اور اس کو بے اختیار سینے سے لگالے گا۔" آہا ہدایت کتنا پیارا ہے"۔

بغیر مدد اور سہارے کے نہ تو کوئی چیز زندہ رہ سکتی ہے اور نہ پھل پھول سکتی ہے۔ پودوں کو پانی دیا جاتا ہے اور غذا پہنچائی جاتی ہے لیکن اخبارات اور رسالوں کو محنت سے ترقی دی جاتی ہے۔ ہدایت کو ترقی دینے میں جن دوستوں نے ہماری مدد کی ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح ہمارا ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔ حفیظ بھائی، صفدر صاحب، محسن صاحب اور بھائی بشیر احمد خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے دن رات کام کیا اور اس کی خاطر بہت تکلیف اٹھائی۔

سب سے آخر میں ہمیں قبلہ ہمایوں صاحب مالک قومی کتب خانہ اور احسن صاحب مالک "ہدایت" کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ لیکن ان کی مہربانیاں اتنی زیادہ ہیں کہ صرف "شکریہ" کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اے کاش! وہ ہمارے دل کا حال جان جائیں۔ "ناجو"

ہدایت کے ۱۹۴۸ء کے آزادی نمبر میں صفحہ ۲۵ پر ایک مختصر مضمون شائع ہُوا جس کا عنوان تھا "ماں کی دُعا" اس میں ناجو کے اپنے کردار کی جھلک ملاحظہ ہو:-

"اے خُدا۔ اے ہمیں پیدا کرنے اور آزادی بخشنے والے! میرے بیٹے کی حفاظت کر۔ ہر جگہ اور ہر وقت وہ جہاں جائے تو اس پر رحمت کا سایہ ڈال۔ رات کو جب وہ تن تنہا پہرے پر کھڑا ہو تو اس سے باتیں کر اور جب وہ ظالم دشمن سے لڑ رہا ہو تو اسے بہادری پر ابھار۔

اے خُدا! مجھ عاجز کی دُعا سُن لے اور میرے دل کی باتیں اس کے دل میں

ڈال دے۔ اے خدا! میرے بیٹے کو تجھ پر اور صرف تجھ پر بھروسہ ہے اور تو اسے ایسا بنا کہ وہ ہمیشہ تجھ پر ہی بھروسہ رکھے۔ وہ اپنے ملک کی عزت اور اپنی آزادی کے لئے لڑ رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ فتح حاصل کرے گا۔ لیکن فتح ابھی دُور ہے۔ اے خدا اس دوران میں تو اس کی ہمّت بلند اور ارادہ مضبوط رکھ۔

وہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا اور سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ اے خُدا! اس کی حفاظت کر۔ اس کی تندرستی قائم رکھ اور اسے ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا۔ مجھے اس پر فخر ہے اور اس کی بہادری پر پختہ یقین۔ اے خُدا! میری یہ باتیں اس تک پہنچا دے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہ۔ تاکہ وہ کبھی تجھ سے منہ نہ موڑے اور اسے ایسا بنا کہ وہ اپنے وطن کی خاطر جئے اور اپنے وطن کی خاطر مرے۔ آمین۔ ”ناجو“

پہاڑ کی کہانی

اس مختصر مضمون ”ماں کی دُعا“ کے برعکس ”پہاڑ کی کہانی“ ابتدائی زمانے میں عنایت اللہ کی طویل طبعزاد تحریر ہے۔ جس سے ان کے طالب علمی کے محبُوب مضمون کا کھوج مِلتا ہے۔ انہیں جغرافیے سے خاص شغف تھا۔ بچّوں کے لئے لکھی ہُوئی اس کتاب کے چند ابتدائی حصّے ملاحظہ ہوں۔

”اے صاحبو! چہرہ مہرہ اور ڈیل ڈول دیکھو تو میں ایک سنگ ریزہ ہوں۔ ایک ننھی منی بے قیمت سی شے۔ جسے آپ دن میں کتی مرتبہ روندتے اور ٹھوکریں مارتے گزر جاتے ہیں لیکن کیسے کہوں اور آپ کو کیونکر یقین آئے کہ آج سے کتی ہزار سال پہلے میں ایک پہاڑ تھا۔ بلندی میں آسمان سے باتیں کرنے والا اور چوڑائی میں دُور دُور تک پھیلا ہوا۔ لیکن اس بیچ میں مجھ پر کیا گزری اور میں پہاڑ

سے ایک سنگ ریزہ کیسے بن گیا۔ یہ ایک دُکھ بھری کہانی اور عجیب و غریب قصّہ ہے۔ اوّل تو کچھ کہنے سننے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ بہت جی کڑا کر کے دو چار باتیں اوٹ پٹانگ کہہ بھی دوں تو روتے روتے گھگھی بندھ جاتی ہے اور چپ سادھے ہی بنتی ہے۔

اپنی بیتی کہنا اور کسی کی سننا دونوں کٹھن کام ہیں۔ جی جلتا ہے اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔ سوچتا ہوں من مار کے اپنا قصّہ کہہ ہی دوں تو اچھا ہے۔ بھلے سے آج مل بیٹھے ہیں۔ شاید اسی طرح کچھ بھڑاس نکل جائے۔ ورنہ اس نگوڑے جی کا کیا ہے۔ رو دھو کے آپ ہی آپ سنبھل جائے گا۔ یوں بھی اب چل چلاؤ ہے۔ تن بدن تو پہلے ہی ختم ہو چکا۔ لے دے کے اب ایک ننھی سی جان باقی ہے سو اس کا بھی کیا بھروسہ۔ کسی دن بیٹھے بٹھائے بھلے چنگے میں سن سے نکل جائے گی۔ پھر دُنیا میں اپنا کون ہے جو سدا یاد رکھے۔ ادھر آنکھیں بند ہوئیں ادھر دُنیا والے بھول گئے۔ قصّے اور کہانیاں البتہ باقی رہ جاتے ہیں ایک دوسرے سے کہتا ہے دوسرا تیسرے سے اس طرح بات برسوں اور صدیوں تک چلتی رہتی ہے۔ سو ایک قصّہ میں بھی کہے جاتا ہوں۔ سن چکو اور اللہ میاں توفیق دیں تو مجھ بدنصیب کی قسمت پر دو آنسو بہا دینا۔

میں کب اور کیسے پیدا ہوا۔ یہ آنکھوں دیکھی بات تو نہیں سنی سنائی کہانی ہے بڑی لمبی اور بہت پیچ دار۔ برسوں میں سنی اور اتنا ہی وقت سمجھنے میں لگا۔ اسے چھیڑ دوں اور الف سے لے کر بڑی "ے" تک آپ کو سناؤں تو پہر گزر جائیں پر اس کا سرا دکھائی نہ دے۔ اس لیے سوچتا ہوں بات چھوٹی ہو تو اچھا ہے۔ پھر کبھی میل ہوا اور اللہ میاں نے چاہا تو رہا سہا قصّہ بھی سنا دوں گا۔

میرے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ یہ دُنیا جس میں میں اور آپ بستے ہیں سُورج

ہی کا ایک حصّہ ہے۔ پہلے پہل نہ تو یہ دُنیا تھی نہ چاند اور نہ تارے۔ چاروں طرف سُورج ہی کا راج تھا۔ سُورج دیکھنے میں آگ کا ایک گولہ ہے لیکن دوستو بڑے کام کی چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو چاند تارے اور یہ دُنیا کہیں دکھائی نہ دیتے اور شاید ہم آپ بھی نہ ہوتے۔ سُورج صبح سویرے پورب سے نکلتا ہے اور دن بھر چمک دمک کر پچھم میں چھُپ جاتا ہے۔ اس طرح دن رات ہفتے مہینے اور سال بنتے ہیں۔ گرمی کے بعد سردی اور بہار کے بعد خزاں آتی ہے لیکن آج سے اَن گنت سال پہلے یہاں کچھ بھی نہ تھا نہ دن رات تھے اور نہ گرمی سردی۔

پانی سے لڑائی

اس کے بعد میرا جنم "سفید بال" اور برف کے دریا" کے عنوانات کے تحت معلوماتی باتیں لکھنے کے بعد "پہاڑ کی پانی سے لڑائی" کا قصّہ بیان کرتے ہُوئے آخر میں عنایت اللہ نے لکھا۔

پھر ایک سال عجب تماشا ہُوا۔ گرمی کے دن تھے۔ دھُوپ خوُب زوروں پر چمک رہی تھی۔ ایک دن صبح سویرے آنکھ کھلی تو برف کا ڈھیر غائب تھا۔ اس کی جگہ پانی کی ایک جھیل لہریں لے رہی تھی۔ برف کہیں نام کو بھی دکھائی نہیں دیتی تھی سامنے پانی ہی پانی تھا۔ تین طرف پہاڑ تھے ایک طرف میں تھا۔ پانی کے لئے باہر نکلنے کے سب راستے بند تھے اب تو میرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ سوچا اب پانی سے مقابلہ پڑا ہے خدا خیر کرے اتنے میں پانی نے میرے پاس سے باہر نکلنے کا ایک راستہ بنا لیا۔ پھر تو دم ہوا ہو گیا۔ پانی ٹھہرا رہے تو مصیبت اور بہہ نکلے تو اس کے کیا ہی کہنے۔ بڑے بڑے جنادری پہاڑ اس کے راستہ میں نہیں ٹھہر سکے۔ پھر میں تو پہلے ہی مرا ہوا سا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مدتوں اس ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔ آخر جی میں یہی فیصلہ ٹھہرا کہ

جب مرنا ہے تو پھر خوف کا ہے کا۔ مصیبت سر پر کھڑی ہے آج آئی کہ کل آئی۔ کیوں نہ بہادروں کی طرح اس کا مقابلہ کروں اور لڑتے لڑتے میدان میں کام آؤں۔ آج میں اس کے مقابلہ سے ہٹ گیا تو کل کوئی دُوسرا اس کے قابو میں آجائے گا۔ یہ سوچ کر میں اپنا آپ سمیٹ پانی کے چھوٹے سے منہ پر جا کھڑا ہوا۔ اب تو پانی بھی سٹپٹایا۔ اندر ہی اندر سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ پانی رک جانے سے چھوٹے چھوٹے کئی دریا سُوکھ گئے تھے۔ بہتیرا اس نے سر پٹکا بہتیرے داؤں کھیلے۔ لیکن صاحب میں بھی ایک ہی ضدی اور دھن کا پکا تھا اپنی جگہ سے دو ہاتھ اِدھر اُدھر نہ ہُوا۔ میں جی ہی جی میں بہت خوش تھا کہ پانی خوب قابو میں آیا۔ میں تو جو پھنسا ہوں سو پھنسا ہوں۔ میرے دُوسرے بھائی تو محفوظ ہیں لیکن صاحبو! قسمت کا لکھا ہو کر رہتا ہے اور ساری شیخیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ ادھر کچھ سالوں میں جھیل کا پانی اتنا بڑھ گیا کہ میرے لئے اس کی روک تھام مشکل ہو گئی۔ جب تک مجھ میں برتا تھا خم ٹھونک کر کھڑا رہا۔ آخر ایک دن راستہ چھوڑتے ہی بن پڑی۔ اب میدان پانی کے ہاتھ میں تھا جو اس کے جی میں آئی اس نے کی۔ ہارے کو کون پُوچھتا ہے ایک دھکا اس زور سے مجھے دیا کہ میں دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اب کیا بتاؤں راستے میں مجھ پر کیا کیا گزری۔ لاکھوں بار سر کے بل گرا۔ اٹھا۔ پھر گرا اور اوپر نیچے پانی کے اتنے تھپیڑے کھاتے کہ رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ کئی سو میل کے سفر کے بعد اب میں ایک میدان میں تھا۔ یہاں پہنچتے ہی دریا کی چال دھیمی ہو گئی۔ میں سمجھ گیا۔ اب پانی میں زور نہیں رہا۔ فوراً اپنی جگہ پر ڈٹ گیا۔ پھر تو پانی نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن اس کی ایک بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ دریا بہتا رہا اور میں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ اپنی

دال گلتی نہ دیکھ کر دریا نے اپنا راستہ بدل لیا اور مجھے چھٹی مل گئی۔

اب میں سُوکھ کر کانٹا رہ گیا تھا۔ میری برادری سے کوئی مجھے دیکھ پاتا تو کہتا "ہائیں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کبھی موٹے تازے تھے اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ سامنے بیٹھے ہوئے دکھائی نہیں پڑتے۔ کچھ تو کہو۔ ہم بھی سنیں یہ حالت کیوں ہوئی؟" لیکن میں کیا کرتا جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب میں پہاڑ نہیں ایک سنگ ریزہ تھا۔ مدتوں دریا کنارے پڑا رہا۔ وہاں چاروں طرف ریت ہی ریت تھی اور گرمی اس قدر سخت کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ رات کو ٹھنڈ ہوتی۔ دن کو گرمی۔ کبھی پھیلتا۔ کبھی سکڑتا۔ لیکن یہ دھندا زیادہ دیر نہ چل سکا اور ایک دن وہ ٹوٹ پھُوٹ ہوئی کہ میرے ٹکڑے ہو گئے۔ کچھ ٹکڑے ریت میں جا ملے اور ایک ٹکڑا آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔"

عنایت اللہ اپنے آپ کو سنگریزہ سمجھتے رہے لیکن وہ ایک عزمِ صمیم کی مستحکم چٹان تھے۔ ان کی یادگار مشرق، بین الصوبائی رابطے اور وحدتِ فکر کا ایک سلسلہ کوہ ہے جن کی عبارت ایسے ہی کتنی سنگریزوں سے ہوئی ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کوہ کو برقرار رکھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

صحافتی انقلاب کا نقیبِ اوّل

اردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو ایسی شخصیات کی ایک قطار سامنے آجائے گی جنہوں نے اس کی نوک پلک سنواری۔ مولوی محمد باقر نے ابتدائی دور کی کٹھن منزل طے کی، سر سیّد احمد خاں نے صحتِ معلومات اور زبان کی سلاست اور ٹائپ کی طباعت سے اسے ایک نئی راہ پر چلایا۔ مولوی محبوب عالم نے ایک پیسے میں اخبار فروخت کرکے قارئین کی ایک نئی کھیپ تیار کردی۔ ظفر علی خاں نے بہت سے ادیب اپنے گرد اکٹھے کرکے اردو صحافت میں ایک نیا ٹھاٹھ پیدا کیا اور خبر رساں اداروں کی خدمات حاصل کرکے اسے انگریزی صحافت کے برابر لانے کی کوشش کی۔ غلام رسول مہر نے اداریہ نگاری کو ایک نیا جلال بخشا۔ سالک نے اردو صحافت میں مستقل مزاحیہ کالم کی بنیاد رکھی۔ چراغ حسن حسرت نے میک اَپ کی نئی طرح ڈالی۔ حمید نظامی نے مختصر اداریہ نگاری کی رسم جاری کی، ان شخصیات اور دوسرے ہم عصر اخبار نویسوں نے آزادیٔ صحافت کی جنگ لڑی اس کے لئے قربانیاں دیں، کچھ لوگ پکڑ دھکڑ کے شکار ہوئے، ضمانتیں ادا کیں اور ضبط کرائیں یا چھاپے خانے نذرِ سرکار کئے، ساری عمر افلاس میں گزاری لیکن

قلم کی عصمت کو محفوظ رکھا۔ یہ دیکھنا ہے کہ اردو صحافت آج ترقی کے جس دور سے گزر رہی ہے اس میں عنایت اللہ کا کردار کیا تھا؟

عنایت اللہ میدانِ سیاست کے کھلاڑی نہیں تھے، آزادیٔ صحافت کے سلسلے میں بھی انہوں نے کوئی براہِ راست کارنامہ سرانجام نہیں دیا لیکن انہوں نے اردو صحافت کو جس انقلاب سے آشنا کیا۔ اگر اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انہیں اردو صحافت کی تاریخ میں کلاسیکی صحافیوں کے پہلو بہ پہلو ایک ممتاز مقام حاصل ہے یوں تو وہ مدت مدید سے میدان صحافت میں موجود تھے لیکن ان کے جوہر اس وقت کھلے، جب ۱۹۵۸ء کے مارشل لا نے سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دے کر ایک لحاظ سے صحافت کو للکارا کہ اگر تم میں کوئی دم خم موجود ہے تو اس قبرستان کے سے سناٹے میں اپنی افادیت ثابت کرو، اس وقت ہمارے اخبار سیاسی تنازعات کے چٹخارے سے محروم ہو کر بے رنگ اور سپاٹ بن چکے تھے، عنایت اللہ پہلے صحافی تھے جنہوں نے اس للکار کا جواب دیا اور پورے جذب و جنوں کے ساتھ کام کر کے اردو صحافت میں ایک نئی شان اور ایک نیا شکوہ پیدا کر دیا۔ انہوں نے سوا سو سال پرانے لیتھو طریق طباعت کو چھوڑ کر آف سیٹ طریق طباعت اختیار کیا۔ تصویری صحافت کی بنیاد رکھی اور اس کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا۔ خوش نویس طبقے کے بعض افراد کو میک اپ کے نئے اصولوں کی تربیت دی اور یوں آرٹ ایڈیٹروں کی ایک کھیپ تیار کر دی۔ ان اقدامات سے اردو اخباروں میں ایک ایسا حسن و جمال پیدا ہوا۔ جس سے وہ پہلے ناآشنا تھے اس کے ساتھ ہی باطنی حسن کی طرف توجہ دی خبروں کی فراہمی، انداز تحریر اور پیش کش میں نئی راہیں نکالیں۔ عام روش سے ہٹ کر اس رجحان کو آگے بڑھایا کہ بڑی شخصیتوں کے پہلو بہ پہلو چھوٹی شخصیتوں کے

خیالات بھی پیش کیئے جائیں معاشرے کے ہر طبقے کو اخبار میں جگہ دی جائے تاکہ اخبار عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا ترجمان بن جائے، نتیجہ یہ نکلا کہ عنایت اللہ کے اخبار "کوہستان" کی اشاعت پینسٹھ ہزار تک پہنچ گئی، جو اردو صحافت کی تاریخ میں عدیم النظیر تھی، جب انہوں نے "مشرق" نکالا تو یوں محسوس ہوا۔ جیسے صحافت میں انقلاب آگیا ہے کیونکہ "مشرق" اردو کا پہلا مکمل اخبار تھا، پہلی مرتبہ عورتوں اور بچوں مزدوروں، طالب علموں اور کسانوں کے لئے مستقل صفحات یا کالم جاری کیئے گئے۔ ترقی یافتہ ممالک کے جدید ترین اخباروں کی طرح فیچر نگاری پر خاص زور دیا گیا۔ خبروں کی پیش کش میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری کو رواج ملا کہ انگریزی اخبارات ہیچ نظر آنے لگے۔ میک اپ کا ایک بالکل نیا اور پرکشش روپ سامنے آیا۔ ہم عصر صحافت اسے دیکھ کر چلا اٹھی کہ یہ کیا بدعت ہو رہی ہے لیکن انقلاب آچکا تھا اس کے ریلے کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لئے رفتہ رفتہ تمام اخبار اس انقلاب سے بہت بڑی حد تک متاثر ہونے لگے اور اگر زبان سے نہیں تو عمل سے سب نے عنایت اللہ کی انقلابی صحافتی قیادت قبول کر لی عنایت کی بدولت انگریزی صحافت کی سیادت الٹ گئی تھی اردو اخباروں نے ایسا عوامی رنگ لیا کہ ان کی اشاعتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ جو اخبار پہلے بہت تھوڑے لوگ پڑھتے تھے، اب عوام الناس میں مقبول ہو گئے پہلے اخبار کا مطالعہ صرف خاندان کا سربراہ کرتا تھا اب خاندان کے تمام افراد پڑھنے لگے اور ظاہر ہے اس سے عوامی شعور تیز ہو گیا،

بعض عناصر نے عنایت اللہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے صحافت کی اخلاقی قدروں سے انحراف کو فروغ دیا۔ میرے نزدیک اس الزام کا کوئی جواز نہیں۔ میں نے برعظیم کے ان بہت سے انگریزی فارسی اور اردو اخبارات کے فائلوں کا مطالعہ کر رکھا

ہے، جو کم و بیش دو سو سال کے دوران میں نکلے میں اپنے مطالعہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ سر سید کے "تہذیب الاخلاق" اور "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کے سوا کم و بیش ہر اخبار میں سنسنی خیزی، فحاشی اور عریانی کے مظاہرے ہوئے جن کلاسیکی صحافتی شخصیتوں کی آج ہم پرستش کرتے ہیں ان کے اخبار بھی ایسی چیزوں سے مبرا نہ تھے۔ آزادی سے پہلے اور بعد میں نکلنے والے اخباروں میں اس ضمن میں کبھی کبھی حدود سے خاصا تجاوز ہوتا رہا ہے میرے نزدیک عنایت اللہ کے اخباروں میں فحاشی اور عریانی اگر موجود تھی تو پہلے کے مقابلے پر زیادہ نہیں، بہت کم تھی اور جہاں تک سنسنی خیزی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر خبر سنسنی خیز ہو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہاں اگر کسی معمولی خبر سے دیدہ دانستہ سنسنی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ قابل اعتراض ہے، عنایت اللہ ایسی سنسنی خیزی کے قائل نہیں تھے البتہ وہ خبروں کی ڈرامائی پیش کش کے ضرور قائل تھے، لیکن اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ قارئین کی توجہ خبر کی طرف دلائی جاتے۔ عنایت اللہ کی ایک اور بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اخبار کو ذاتیات کے عنصر سے محفوظ رکھا۔ نہ کسی کو گالی دی، نہ کسی کی بے جا خوشامد یا تعریف کی۔ بعض اخباروں میں ان کے خلاف دشنام طرازی کا بازار گرم رہا لیکن انہوں نے کبھی جواب نہیں دیا۔

آزادیٔ صحافت کے بارے میں عنایت اللہ کا تصور یہ تھا کہ اخبار کا کاروباری پہلو مضبوط ہو تو وہ آزاد رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ کاروباری اعتبار سے کمزور ہو تو دوسروں کا محتاج ہو کر اپنی آزادی سلب کرا لیتا ہے کیوں کہ محتاجی ہی دوسروں کا غلام بناتی ہے ان کا یہ نظریہ بھی تھا کہ اخبار نویس کی تنخواہ تھوڑی ہو تو وہ ناجائز فوائد کا رخ کرتا ہے، لیکن اگر اسے اچھا مشاہرہ دیا جائے تو وہ اپنی عزتِ نفس کو محفوظ رکھ سکتا ہے چنانچہ انہوں نے ایک تو اخبار کو کاروباری بنیادوں پر چلایا دوسرے اجرتی بورڈ کے فیصلے

سے پہلے ہی اخبار نویسوں کے لئے بہتر مشاہروں کا بندوبست کیا اور اس طرح کوشش کی کہ اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور اخبار نویسوں کی عزتِ نفس مجروح نہ ہونے پائے۔

حسن معاملت اور فن صحافت سے گہری آگہی کی بنا پر عنایت اللہ کی کاروباری ساکھ اتنی تھی کہ انہوں نے صرف پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے اخبار جاری کیا اور چند سال کے اندر اندر اس کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ ہو گئی یہ کیسے ممکن ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کاروباری حلقوں میں ان کی ساکھ ایسی تھی کہ نیوز ایجنٹوں نے تین لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم ضمانت کے طور پر جمع کرا دی۔ ایک عرصے تک کاغذ اور طباعت ادھار ہوتی رہی اور چند سالوں کے اندر اندر کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ نہ صرف تمام قرضے مع سود کے بے باق ہو گئے بلکہ اپنا پریس بھی لگا لیا اور آج مشرق منافع پر چل رہا ہے اور اپنے کارکنوں کو منافع میں بھی حصہ دیتا ہے اور بونس بھی دیتا ہے

عنایت اللہ کی یہ خدمت کیا کم ہے کہ انہوں نے صحافت کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، دن رات اس کے ہو رہے اور جب اللہ کو پیارے ہوئے تو یہ حقیقت کھل کر انہوں نے کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ کوئی زمین نہیں خریدی، کوئی بنک بیلنس نہیں چھوڑا۔ حالانکہ ان سے کم پائے کے بہت سے اخبار نویس صاحب جائیداد بن چکے ہیں اور یہ بات تو مرحوم کے قریبی احباب جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کتنی سادہ تھی وہ کتنے سادہ مکانوں میں رہتے تھے اور ان کا ڈرائنگ روم کتنا سادہ تھا اور ان کے پاس کوئی ذاتی کار بھی نہیں تھی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اچھی تنخواہ پانے کے باوجود انہوں نے کچھ نہ بنایا؟ یہی کہ وہ بہت سے ضرورت مندوں کی کفالت فرماتے تھے اور انہوں نے بڑے بڑے اخباروں سے وابستگی کے باوجود کبھی ناجائز وسیلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

محسنِ صحافت

ہر اخبار نویس شہرت کا آرزومند ہے اور اگر یہ آرزو مصنوعی کوششوں کا سہارا نہ لے تو اس میں قباحت کی کوئی بات نہیں لیکن عنایت اللہ اس آرزو سے بھی بالا تھے انہوں نے "مشرق" کو اس ٹھاٹھ سے نکالا کہ ہر طرف ہلچل مچ گئی لیکن اس پر اپنا نام نہ دیا اور یہ روایت ایسی قائم رہی کہ مرتے دم تک "مشرق" میں نہ کبھی ان کی تصویر چھپی نہ نام شائع ہوا نہ بیماری کی اطلاع درج ہوئی۔ گویا قارئین کو "مشرق" کے بانی خالق اور روح رواں کا علم اس وقت ہوا جب وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے میں نے برعظیم کی صحافت کے علاوہ دیس دیس کی صحافت کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شہرت سے بے نیازی کی ایسی کوئی مثال نہیں دیکھی کہ اپنی ذات کی مکمل نفی کر دی جائے اپنے رفقائے کار کو شہرت کے بام عروج تک پہنچا دیا جائے حتیٰ کہ اپنے کارنامے بھی انہی سے منسوب کر دیئے جائیں۔ عنایت اللہ کے کردار و اخلاق کا یہ پہلو اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ کارکن صحافیوں کے مرتبے کو بلند کرنے میں اپنے تمام ہم عصروں سے آگے تھے،

عنایت اللہ ایک صاحب جنون اور صاحبِ عشق شخصیت تھے، ان کا عشق صحافت سے تھا اور ان کا جنون یہ تھا کہ اچھے سے اچھا اخبار تیار کیا جائے ایک بار میں نے کہا۔ عنایت صاحب آپ شادی کیوں نہیں کرتے اس سے زندگی میں ایک باقاعدگی ایک ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے ہنس کر بولے فرصت کہاں ہے؟ میں نے کہا بھلا اتنی مصروفیت بھی کیا کہ انسان نارمل زندگی بھی نہ گزار سکے۔ کہنے لگے شادی سے کیا فائدہ ہوگا؟ میں نے کہا بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے آپ کو زندگی کا ساتھی ملے گا اولاد ہوگی۔ آپ اس کی پرورش میں لذت محسوس کریں گے اور

وہ آپ کے نام کو روشن کرے گی۔ اس پر عنایت اللہ کہنے لگے سچی بات یہ ہے کہ میں نے مشرق کو زندگی کا ساتھی بنا رکھا ہے اور جو کارکن کام کرتے ہیں یہی میری اولاد ہیں جب ان میں کوئی محنت سے کام کرتا ہے تو مجھے مسرت ہوتی ہے اور کوئی سُست رفتار ہوتا ہے تو مجھے افسوس ہوتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ ان سے میرے تعلق میں کمی نہ آئے۔ بر سبیلِ تذکرہ وفات سے دو سال پہلے انہوں نے شادی کر لی اور ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ اللہ کرے یہ بچہ پھلے پھولے اور باپ کا نام روشن کرے

"مشرق عنایت اللہ کا منتہائے مقصود نہیں تھا اور نہ وہ اسے مثالی اخبار قرار دیتے تھے وہ اکثر کہتے تھے کہ اگر سرمایہ میسر ہو اور ایسے تربیت یافتہ اخبار نویس موجود ہوں جو مسلسل مطالعہ کو شعار بنائیں محنت سے کام لیں اور اخبار نویسی ہی کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنائیں تو میں اسے ایک مثالی اخبار بنا سکوں گا ان کے ذہن میں ایک تجویز اکثر رہتی تھی وہ یہ کہ ایک اخبار جاری کیا جائے اس کی تقطیع "مشرق" سے نصف ہو قیمت بہت کم ہو۔ تصویریں زیادہ ہوں خبریں اور اداریئے مختصر ہوں ان کی زبان اتنی سادہ ہو کہ معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی آسانی کے ساتھ سمجھ لیں ان کا خیال تھا کہ اگر مناسب سرمایہ لگایا جائے تو ایسا اخبار چلانا مشکل نہیں۔

ریاض بٹالوی

وُہ کہتے تو کیا کہتے؟

عنایت صاحب کی زندگی میں متعدد رسائل و جرائد کے مدیران اور ممتاز صحافیوں نے ان سے فنِ صحافت اور مسائل زندگی پر انٹرویو لینے کی خواہش ظاہر کی مگر عنایت صاحب ٹال گئے۔ وہ طبعاً پس منظر میں رہنا پسند کرتے تھے اور خود نمائی سے گریز کرتے تھے۔ ان میں گمنام رہنے کی یہ عادت اتنی شدید تھی کہ ادارے کے فوٹوگرافر چوری چھپے ان کی تصویریں بناتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر مجھے بھگا دیا تھا کہ "مجھ سے کیا قصور سرزد ہو گیا ہے"۔

ان کی زندگی میں میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی لیکن میں اس کوشش میں لگا رہا کہ ان کے نظریات اور خیالات کو جمع کرتا رہوں۔ عنایت صاحب کی وفات کے بعد اپنی یہ دیرینہ خواہش پوری کر رہا ہوں۔ یہ انٹرویو تو خیالی ہے اور نہ تصوراتی۔ میں نے خواب و خیال میں ان سے سوالات نہیں پوچھے نہ ہی ان کی روح سے جوابات حاصل کئے ہیں بلکہ مرحوم کی بارہ سالہ رفاقت اور قربت کے دوران ہونے والی اس گفتگو کا نچوڑ پیش کر رہا ہوں، جن سے ان کے عزائم، خواہشات، اصولوں اور نظریات کا بخوبی اندازہ لگایا جا

سکتا تھا۔

سوال:۔ عنایت صاحب! آپ متعدد اخباری اداروں کے بانی اور ایک ممتاز منفرد اخبار نویس ہیں۔ آپ نے یہ مقام کیسے حاصل کیا؟

جواب:۔ میں سمجھتا ہوں کہ اخبارات نکالنا آسان ہے مگر ان کا چلانا اور باقی رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ وہ اس لئے کہ اخبار جاری کرنا ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو ایک فرد بھی کر سکتا ہے مگر اس تخلیقی عمل کو آگے بڑھانے کے لئے ایک ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اپنے تجربات کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کسی اخبار کو قائم رکھنے اور اس کو کامیاب بنانے کا تمام تر دارومدار بے لوث، محنتی، فرض شناس اور دیانت دار کارکنوں کی ایک مربوط ٹیم پر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اخبار کا بانی ہونا اہم بات نہیں، اخبار کو چلانا قابلِ توجہ امر ہے۔ محنتی اور بے لوث کارکن کسی ادارے کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میرے مشن کو کامیاب بنانے میں میرے ساتھیوں کا بہت بڑا حصّہ ہے اور وہ اس نصب العین کی روشنی میں کام کرتے ہیں کہ محنت کے بغیر کوئی مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: آپ کے نزدیک ایک اچھے اخبار کی کیا تعریف ہے؟

جواب:۔ میرے خیال میں" اچھا اخبار وہی ہو سکتا ہے جسے لوگ اچھا سمجھیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اچھا اخبار وہ ہے جو عوام کے ہر طبقہ کے لئے ایسا مواد فراہم کرے جو اس کے ذوق پسند اور ضرورت کی تسکین کر سکے اور اپنے قاری کی توقعات پر پورا اترے۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اخبار میں مختلف طبقے کے لوگوں کے لئے ان کے نقطۂ نظر کے مطابق مواد مہیا کیا جائے۔ تعلیم سے متعلقہ خبریں، طلبا اور اساتذہ کو پیش آمدہ مسائل کے مطابق چھاپی جائیں۔ صنعت اور تجارت کے موضوع پر ایسے مضامین

لکھے جائیں جو محنت کشوں اور دکانداروں کی مشکلات اور صنعت کاروں اور تاجروں کے مسائل کو "پروجیکٹ" کریں۔ انتظامی امور کے معاملات کو اس انداز سے فیچروں کے قالب میں ڈھالا جائے کہ دفتری کارکن اور اہل کار یہ محسوس کریں کہ ان کے جذبات اور احساسات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ "مشرق" میں کسی حد تک یہی انداز اپنایا گیا ہے۔

سوال :۔ آپ اخبار کی کامیابی کے لئے کس بات کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں ؟

جواب :۔ "دیانت داری اور نیک نیتی"۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر کام جو نیک نیتی سے کیا جائے یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ نیک نیت شخص کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد سے کس حد تک مخلص ہے اور دیانت داری میں یہ بات شامل ہے کہ جو کام کسی کو سونپا گیا ہے وہ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسی اصول کو مدِنظر رکھا ہے۔

سوال :۔ آپ صحافت کو مشن سمجھتے ہیں یا صنعت ؟

جواب :۔ "صحافت اپنے فرائض کے اعتبار سے مشن ہے۔ رائے عامہ کی تربیت ایک اخبار کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے اُسے بلاخوف وخطر برائیوں کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیئے۔ اور تمام مصلحتوں سے بالاتر ہو کر ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اور ظاہر ہے ایک اخبار یہ فرض مشن کے طور پر ہی ادا کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسے فرض کی تکمیل اور اس کے مثبت نتائج سے صحافی کو جو خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اخبارات اپنے (STRUCTURE) (ڈھانچے) کے اعتبار سے صنعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک اخبار بہت سے لوگوں کی محنت کا ثمر ہوتا ہے جس میں ایڈیٹر سے لے کر خوشنویسوں تک اور جنرل مینجر سے لے کر پریس ورکرز تک سبھی کی مساعی کو دخل حاصل ہوتا ہے۔ معاشرتی اور معاشی بنیادوں پر ان کے حالاتِ کار کو بہتر بنانا صنعتی ضرورت ہے اور اخباری صنعت، پرانے اور فرسودہ دور سے نکل کر

طباعت اور اشاعت کے جدید دور میں داخل ہو رہی ہے اس کے لئے نئی مشینری کی تنصیب اور جدید طریقوں کو اپنانا ناگزیر ہے اور ان تبدیلیوں کے لئے اخبارات کو صنعت کے طور پر تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔

سوال :۔ ماضی میں اخبارات کا کردار ہمیشہ سیاسی رہا ہے اور وہ عام طور پر عوام کی سیاسی ضرورت پوری کرتے تھے لیکن آپ نے اخبار کو سماجی ضرورت بنا دیا ہے۔ آخر کیوں؟

جواب :۔ اس لئے کہ جو اخبار محض سیاسی ضرورت پوری کرتے ہیں میرے نزدیک ان کی مثال ایسے دسترخواں کی ہے جس پر صرف ڈش سجی ہوتی ہے اور سب کو مجبور کیا جاتا ہے کہ یہی ڈش کھائیں۔ خواہ انہیں پسند ہو یا نہ ہو۔ آج کے مشینی، مادی اور برق رفتار دور میں ایک فرد کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ ہمیں روزمرّہ زندگی میں حالات کے کئی رُخ اور کئی رُوپ دیکھنے پڑتے ہیں اور ایک اچھے اخبار کا فرض ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کے لئے لوگوں کی رہنمائی کرے اور حالات کے نشیب و فراز اور روزمرّہ کی ضرورتوں کی نشاندہی کرے۔ دن چڑھنے کے ساتھ کسی شخص کو یہ پریشانی لاحق نہیں ہوتی کہ آئندہ انتخابات کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ اور بالغ رائے دہی کے لئے عمر کی کیا حد مقرر کی گئی ہے، بلکہ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ آج کیا پکایا جائے تاکہ دفتر جانے سے پہلے وہ سودا سلف لا سکے۔ خاتون خانہ یہ نہیں جاننا چاہتی کہ حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کے درمیان کس بات پر سمجھوتہ ہوا ہے، بلکہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ آٹے اور دال کے بھاؤ کیا تھے۔ ان باتوں کے علاوہ ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ ایک شہری کو قانونی حق کس حد تک حاصل ہے۔ ٹریفک کے مسائل کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ ہسپتالوں کی صورتِ حال ابتر کیوں ہے، اور یہ کہ نئی نسل کا چلن کیوں بدل رہا ہے؟ یہ سب کچھ جانے بغیر کسی فرد کی شعوری تربیت نہیں ہو سکتی اور اچھے شہری بننے کے لئے سماجی

مسائل سے آگہی ضروری ہے۔ ہم نے اگرچہ اخبار کو معاشرتی ضرورت بنایا ہے تو ایسا عوام کی خواہش اور حالات کے تقاضے کے مطابق کیا ہے۔

سوال:۔ کیا آپ نے چھوٹے چھوٹے لوگوں کو خبر کا موضوع بنا کر صحافتی معیار کو پست نہیں کیا؟

جواب:۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ چھوٹے چھوٹے لوگ ہی بڑی بڑی خبروں کا موضوع بنتے ہیں، اور پھر کوئی آدمی پیدائشی طور پر بڑا نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی پیدا ہوتے ہی بڑا بن جاتا ہے۔ میں نے اپنے اخبار کو کلاس پیپر (مخصوص طبقے کا اخبار) بنانے کے بجائے پاپولر پیپر (عام آدمی کا اخبار) بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور جو لوگ اخبار پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ مشرق کو عوام میں پسند کیا گیا ہے اور اس کے انداز کو ہر طبقے کے افراد نے سراہا ہے۔ عوام کی پسندیدگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اخبار کا معیار پست نہیں ہوا۔ عام آدمی کی پسند اس کے معیار کی بلندی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم گویا کے صدر کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں لیکن اپنے علاقے کے بلدیاتی نمائندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، لیکن اس بات سے بے خبر ہیں کہ لاہور کے ایک عام مستری نے کار کے انجن میں حیرت انگیز تبدیلی کی ہے۔ ہم اس واقعہ سے تو آگاہ ہیں کہ ڈاکٹر برنارڈ نے ایک جانور کا دل انسانی سینے سے منتقل کر کے سرجری کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے لیکن اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ ہمارے ہسپتالوں میں ڈاکٹر اپنے فرائض کس طرح ادا کر رہے ہیں۔ مشرق نے چھوٹے آدمی کو خبر کا موضوع بنا کر نہ صرف یہ ثابت کر دیا ہے کہ چھوٹے آدمی ہی بڑی خبروں کا موضوع بنتے ہیں بلکہ یہ کوشش بھی کی ہے کہ ایک معاشرے، شہر اور علاقے میں بسنے والے افراد ایک دوسرے کے بارے میں جانیں اور ایسے باصلاحیت اور صاحب۔ فن منظر عام پر آئیں جو اپنی دنیا کے اندر "کارہائے نمایاں" انجام دیتے ہیں۔ مگر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے گمنام رہتے ہیں۔

سوال :- کیا یہ درست نہیں کہ آپ نے پروڈکشن کے اخراجات بڑھا کر اور کارکنوں کو زیادہ اُجرتیں دے کر اخباری صنعت کو مالی اعتبار سے غیر مستحکم بنا دیا ہے؟

جواب :- کیا یہ ضروری ہے کہ نصف صدی پہلے قارئین کو جس قسم کے اخبارات پڑھنے کو ملتے تھے، آج بھی انہیں وہی پڑھنے کو دیتے جائیں۔ لوگوں نے آخر کیا قصور کیا ہے۔ اور ہمیں ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کا کیا حق ہے؟

یہ الزام درست نہیں کہ پروڈکشن کے اخراجات میں اضافے اور کارکنوں کی اُجرتیں بڑھنے سے اخباری صنعت مالی اعتبار سے غیر مستحکم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک پہلے کے مقابلے میں اخبارات زیادہ مستحکم ہیں اور اس کا اندازہ "بیلنس شیٹ" سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہم نے قارئین کو ان کے بدلتے ہوئے ذوق کے مطابق اخبار فراہم کرنے کے لئے اس کی ترتیب جدید خطوط پر کی۔ تزئین اور میک اپ کے نئے شعبے قائم کئے۔ اس کی ضخامت میں اضافہ کیا، خاص ایڈیشن شائع کئے، کلر سپلیمنٹ نکالے اور طباعت و اشاعت کے فرسودہ طریق کار کو ترک کر کے نئے تجربات کئے۔ قارئین نے ان تبدیلیوں کو پسند کیا جس سے اخبارات کی اشاعت بڑھی۔ بڑھتی ہوئی سرکولیشن سے نہ صرف اشتہارات کے حصول میں آسانیاں پیدا ہو گئیں بلکہ نیا اخبار بیں طبقہ پیدا ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ تمام چیزیں آمدنی میں اضافے کا باعث بنی ہیں۔ دوسری طرف کام کی نوعیت کے اعتبار سے کارکنوں کی تعداد بھی بڑھائی گئی اور انہیں معقول اُجرتیں بھی دی گئیں۔ اس طرح کارکردگی بڑھی اور اخبار کو استحکام حاصل ہوا۔ البتہ اخبار کی لاگت میں اضافے سے ان مالکان کو ضرور نقصان پہنچا، جو اخبار کی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنی جیبوں میں ڈال لیتے تھے۔ اخباری کارکنوں کو کم اُجرتیں دیتے تھے اور قارئین کو پروڈکشن کے اعتبار سے فرسودہ اخبار پڑھاتے تھے۔ ہم نے رنگین طباعت کا آغاز کیا تو اسے سُرخی پاؤڈر سے تعبیر کیا گیا۔ اب ہر چیز کلر میں آ رہی ہے۔

لباس کی تراش خراش دیکھیں، زندگی کے بدلتے ہوتے رجحانات پر غور کریں، عمارتوں کی وضع قطع پر توجہ دیں، ہر چیز میں آپ کو تبدیلیاں نظر آئیں گی، ہم نے اگر زندگی کے جدید تقاضوں کے مطابق اخبار کی فرسودگی کو نیا پن دیا ہے تو کونسی قیامت آگئی ہے اور پھر یہ سب کچھ اخبار کو بہتر اور موثر بنانے کے لئے کیا گیا ہے اور اس سے اخباری صنعت کو استحکام حاصل ہوا ہے۔

سوال :- آپ نے کوہستان جیسے مضبوط ادارے کو چھوڑ کر "مشرق" نکالنے کا پروگرام کیوں بنایا؟

جواب :- ہم نے کوہستان سے "شوقیہ" علیحدگی اختیار نہیں کی۔ بعض لوگوں نے جب کارکنوں کی محنت پر جبراً قبضہ کر لیا تو ہم علیحدگی پر مجبور ہو گئے۔"

کوہستان ایک مستحکم ادارہ تھا اور میرے ساتھیوں نے شب و روز محنت کر کے اسے بلند مقام پر پہنچا دیا تھا۔ میں اسے ایک مثالی ادارہ بنانے کا عزم رکھتا تھا اور اس کے لئے میں نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کیا تھا، لیکن جب ایسے لوگوں کی طرف سے جو صحافت کی ابجد سے بھی نابلد تھے، غیر ضروری مداخلت ہونے لگی اور میں نے محسوس کیا کہ یہ مداخلت ادارے کی ترقی میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ میں نے ادارے سے علیحدہ ہونا ہی مناسب سمجھا۔ میری علیحدگی کے بعد میرے ساتھی بھی مجھ سے آن ملے۔ اور ہم نے "مشرق" کے نام سے ایک نئے ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ مشرق جاری کرنے میں یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ کوہستان کے دوران ہم جن تلخ تجربات سے دوچار ہوتے ہیں وہ یہاں نہ دہرائے جائیں اور دوسرے نئے ادارے کی صورت میں ایک ایسا میدان ہاتھ آجاتے جہاں ہم اپنے عزائم کو پورا کر سکیں۔

سوال :- آپ نے اطمینان بخش وسائل نہ ہونے کے باوجود اپنے ادارے میں اس

قدر توسیع کیسے کی ؟

جواب :۔ وسائل سے مراد اگر مادی وسائل ہیں تو یہ جان لیجئے کہ اخبارات صرف پیسے سے نہیں چلتے، اخبار چلانے کے لئے اگر سرمایہ ہی مقصود ہوتا تو بڑے بڑے "سیٹھ" اپنی فیکٹریاں اور ملیں چھوڑ کر اخبارات نکال لیتے اور ہر سرمایہ دار ایک ایک اخبار کا مالک ہوتا۔ اخبارات عزم و ہمت اور محنت و ولولے سے چلتے ہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ "مشرق" کی توسیع اس کے لئے بار آور فائدہ بخش ثابت ہوئی ہے۔ یہ واحد اخبار ہے جو ملک کے چاروں صوبوں سے شائع ہوتا ہے۔ خواتین کے لئے سب سے پہلے ایک مخصوص ہفت روزہ نکالنے کا اعزاز بھی اسی کو حاصل ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم نے مالی وسائل کے بغیر اخبار میں توسیع کا منصوبہ بنایا اور یہ سوچا کہ اخبار میں توسیع کر کے مادی وسائل پیدا کئے جائیں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ اخبار کی یہ توسیع اس کے لئے زیادہ سے زیادہ مادی وسائل پیدا کرنے کا باعث بنی ہے۔

ضیاالاسلام انصاری

کارزارِ صحافت کا سپاہی

عنایت اللہ مرحوم کو اردو اخبارات کے لاکھوں قارئین روزنامہ مشرق کے بانی کی حیثیت سے جانتے ہیں ان میں سے ایک بڑی تعداد کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ عنایت صاحب صرف مشرق کے بانی نہیں تھے، بلکہ اخبارات و جرائد کی بنیاد ڈالنا ان کا مشغلہ تھا اور اس مشغلہ کا آغاز ۱۹۴۴ء سے ہو گیا تھا جب وہ کچھ تفریح اور کچھ تلاش معاش کے سلسلہ میں کلکتہ پہنچے۔ جناب ممتاز مفتی کا کہنا ہے کہ گوجرہ کے جس سکول میں وہ استاد تھے عنایت اللہ مرحوم نے ابتدائی تعلیم اسی سکول سے حاصل کی اور ایک روز انہوں نے جب اس نوعمر طالب علم سے پوچھا کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے تو اس نے کہا تھا "میں ایڈیٹر بنوں گا" ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ اس لڑکے کی خواہش پر حیران رہ گئے کیونکہ ان دنوں لڑکے عام طور پر ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی خواہش کیا کرتے تھے ان میں سے کچھ پائلٹ بننا چاہتے تھے انہوں نے سوچا کہ یہ بچہ عجیب ہے جو ایڈیٹر بننا چاہتا ہے۔ انہیں اس وقت عنایت اللہ کے ایڈیٹر بننے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

عنایت صاحب کلکتہ پہنچے تو انہوں نے دوسرے مشاغل کے ساتھ ایڈیٹر بننے کے خواب کی تکمیل کی راہ بھی نکال لی۔ اپنے دوست حفیظ سرور کے ساتھ

مل کر جو ایک اچھے آرٹسٹ اور کارٹونسٹ ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں عنایت صاحب نے بچوں کا ایک ماہنامہ جاری کر دیا جس کا نام "بچوں کی دنیا" رکھا گیا۔ یہ ماہنامہ صرف اپنے نوعمر ایڈیٹر کے شوق کی تکمیل کا ذریعہ نہیں تھا، بلکہ اس جریدے نے اس نوجوان صحافی کی تشکیل کی جو آگے چل کر جدید صحافت کا بانی اور اخباری کارکنوں کا محسن بنا اور جس نے چمن زار صحافت کی تزئین اور آرائش میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔۔۔ عنایت صاحب کو نہ معلوم اردو اخبارات وجرائد میں اس وقت کیا کیا خامیاں اور بہتری کی کون سی گنجائشیں نظر آئیں جنہوں نے انہیں اردو صحافت کو نئے موضوعات کے تنوع اور طباعت کے جدید طریقوں سے آراستہ کرنے کا بیڑہ اٹھانے پر آمادہ کیا

کلکتہ میں عنایت صاحب کا دل نہ لگا اور بہت جلد لاہور واپس آ گئے، یہ ایک الگ داستان ہے کہ لاہور آنے کے بعد انہوں نے اپنے ذوق کی تسکین اور اپنے مشن کی تکمیل کی راہیں تلاش کرنے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے بہرحال ۱۹۴۶ء میں وہ بچوں کے مقبول جریدے "ہدایت" کے ایڈیٹر بن گئے۔ دو سال تک انہوں نے جس محنت سے ہدایت کی ادارت کی، اس کا ذکر آج بھی ہدایت کے ناشرین بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں، ہدایت عنایت صاحب کے لئے ایک تجربہ گاہ بھی ثابت ہوا اور تربیت گاہ بھی۔ جب انہوں نے ادارت، کتابت اور طباعت کی فنی پیچیدگیوں پر عبور حاصل کر لیا تو وہ اپنے اصل مشن کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں انہوں نے قومی کتب خانہ کے زیرِ اہتمام راولپنڈی سے روزنامہ "تعمیر" کا آغاز کیا۔ روزنامہ "تعمیر" کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ تعمیر نے اپنے انداز فکر اور موضوعات کے اعتبار سے صحافت میں ایک نئی طرح ڈالی تھی، اس اخبار کے سامنے جو مقاصد تھے ان میں اہم ترین مقصد یہ تھا کہ پاکستانی معاشرے کو اس ملک کے قیام کے اسباب و محرکات سے پوری

طرح واقف کرایا جائے اور اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد اس عہد کو فراموش نہ کیا جائے جو تحریک پاکستان کے لیڈروں نے عوام کے ساتھ اور ہندوستانی مسلمانوں نے نئی مملکت میں اسلامی نظام زندگی کے نفاذ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔

عنایت صاحب کچھ عرصہ تعمیر سے وابستہ رہے اور اس دوران انہوں نے اتنی محنت کی کہ ان کی صحت جواب دے گئی وہ جوانی میں تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر علاج کے لئے سینی ٹوریم میں داخل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بالآخر اپنے ایک پھیپھڑے اور چند پسلیوں کی قیمت ادا کرنے کے بعد وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے میدان صحافت میں واپس آئے ایک نئے عزم اور جوش کے ساتھ انہوں نے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو راولپنڈی سے اپنے روزنامے کوہستان کا اجراء کیا۔ کوہستان کے اجراء میں انہیں ممتاز ادیب اور ناول نگار جناب نسیم حجازی کی رفاقت اور تعاون حاصل تھا اور اخبار کی تدوین کے لئے انہوں نے نوجوان صحافیوں ابو صالح اصلاحی اور اقبال زبیری کا انتخاب کیا جن میں سے ایک کو شعبۂ تحریر اور دوسرے کو خبروں کے شعبہ کی نگرانی سپرد کر دی گئی۔ جلد ہی یہ نیا اخبار راولپنڈی میں اتنا مقبول ہو گیا کہ عنایت صاحب کو اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے اور اردو زبان میں ایک مکمل اخبار شائع کرنے کا چیلنج قبول کرنے کے لئے راولپنڈی سے اردو صحافت کے مرکز لاہور منتقل ہونے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چیلنج اور مسابقت کا جذبہ تو ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر تھا، راولپنڈی میں وہ کس سے مقابلہ کرتے؟ اس لئے انہوں نے کوہستان لاہور سے بھی جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

عنایت صاحب آغاز کار کے لئے ہمیشہ اچھے موقع کا انتخاب کیا کرتے تھے

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا دستور نافذ ہو رہا تھا، انہوں نے بھی اپنے نئے ایڈیشن کے لئے اس تاریخ کو پسند کرلیا، راولپنڈی میں انہوں نے اخبار کی ادارت اور انتظامیہ کے شعبوں کے لئے جن ساتھیوں کا انتخاب کیا تھا ان کی صلاحیتوں کو وہ خوب آزما چکے تھے انہوں نے عنایت صاحب کی زیرِ نگرانی اس انتھک محنت کی تربیت حاصل کرلی تھی جسے عنایت صاحب اخبار کی کامیابی کی ضمانت تصوّر کرتے تھے، ان رفقا میں سے جن کی تعداد ابھی بہت زیادہ نہ تھی کچھ کو راولپنڈی چھوڑ اور کچھ کو ساتھ لے کر عنایت صاحب لاہور آ گئے، لاہور سے کوہستان کے اجراء کی تاریخ دستور کے نفاذ کے علاوہ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے تاریخی واقعہ سے بھی متعلق تھی، اس دن کا انتخاب قیامِ پاکستان کے محرکات اور نظریۂ پاکستان سے ان کی گہری جذباتی وابستگی کا ثبوت تھا، کوہستان لاہور کی ترقی اتنی برق رفتار تھی کہ ان کے حریف حیران اور ششدر رہ گئے۔

عنایت صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کاروبار میں دیانت اور صاف گوئی کو بنیادی اہمیت دیتے تھے، ان دنوں پاکستان کے تقریباً تمام اخبار سب سے کثیر الاشاعت اخبار ہونے کے دعوے دار تھے، عنایت صاحب نے کہا کہ اچھے اخبار کو چاہیئے کہ وہ اپنے قارئین اور مشتہرین کو صاف صاف بتا دے کہ اس کی اشاعت کتنی ہے، ان دنوں کوہستان کی اشاعت دوسرے اخبارات سے زائد نہ تھی لیکن عنایت صاحب نے اخبار کی لوح پر روزانہ تعدادِ اشاعت شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تجربہ میں بڑے کاروباری خطرات پوشیدہ تھے لیکن اعتماد کے پتلے اور بات کے دھنی عنایت صاحب تو خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہی میدان میں آئے تھے، انہوں نے بعض دوستوں کی رائے کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے فیصلے

پر عمل کیا۔ کوہستان کی لوح پر ہر روز مجموعی تعداد اشاعت درج ہوتی رہی اور اس اقدام نے اخبار کے قارئین اور مشتہرین کو اتنا متاثر کیا کہ یہ تعداد روز بروز بڑھنے لگی اور خاص طور پر اشتہارات کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور چند ماہ کے اندر ماضی کے کثیر الاشاعت اخبارات 'کوہستان' سے بہت پیچھے رہ گئے۔

کامیابی کی یہ منزل طے کرنے کے بعد عنایت صاحب نے اپنے کاروبار میں توسیع کرنے کی صلاحیت کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا اور اپریل ۵۹ میں ملتان سے بھی 'کوہستان' کی اشاعت کا آغاز کر دیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ۲۱ اپریل کا انتخاب کیا شاعرِ مشرق اور مفکرِ پاکستان، علامہ اقبالؒ سے یہ نسبت ان کے اندازِ فکر و عمل کی مظہر تھی اب کوہستان ملک کا واحد اخبار تھا جو لاہور، راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہو رہا تھا۔ عنایت صاحب کی جدّت پسندی، مہم جوئی اور محنت کا پھل یوں ظاہر ہوا کہ کوہستان صرف کثیر الاشاعت اور مقبول عام اخبار ہی نہیں بن گیا۔ بلکہ صحافیوں اور اخبار کے عملہ کے دوسرے افراد کے لئے بہترین سہولتوں اور زیادہ سے زیادہ معاوضوں کے لئے بھی صحافتی حلقوں میں کوہستان کا نام زیرِ بحث رہنے لگا۔ عنایت صاحب ایک خوشحال اور مطمئن کارکن کو ادارے کی کامیابی کی ضمانت قرار دیتے تھے، اپنے اس تصور کو جب انہوں نے محدود وسائل کے باوجود عملی شکل دی تو نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے اخبارات کے چند ملجھے ہوئے اور تجربہ کار صحافی اور دوسرے کارکن بھی عنایت صاحب کی اس ٹیم میں شامل ہو گئے جو اردو کا ایک مکمل اخبار پیش کرنے کی جد و جہد میں مصروف تھی۔

عنایت صاحب کی یہ ٹیم لاہور، راولپنڈی اور ملتان میں مصروفِ عمل تھی اس دوران میں ان کی مہم جو طبیعت انہیں انگلستان لے گئی جہاں انہوں نے ۱۹۶۱ء

میں اردو صحافت کا پودا لگانے کا فیصلہ کیا جن لوگوں نے بھی یہ خبر سنی حیران رہ گئے کہ لندن سے ایک اردو ہفت روزہ مشرق جاری ہوا ہے۔ ہفت روزہ مشرق برطانیہ میں اتنا مقبول ہوا کہ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے "منادی" کی طرح اس نے نہ صرف لندن بلکہ برطانیہ کے بعض دوسرے شہروں میں بھی اردو اخبارات، اور جرائد کے ابرا کے لئے فضا پیدا کر دی۔ عنایت صاحب پاکستان سے اردو صحافت، کا تحفہ انگلستان لے گئے اور وہاں سے اردو صحافت، کے لئے خبروں کی ترتیب و آرائش اور طباعت کے جدید طور طریقے اپنے ساتھ پاکستان لے آئے، مشرقِ لندن سے بعد ازاں انہیں بوجوہ قطع تعلق کرنا پڑا تو انہوں نے ۱۹۶۹ء میں ایک اور ہفت روزہ "اخبار وطن" جاری کر دیا جو اب برطانیہ کا سب سے مقبول اردو ہفت روزہ ہے۔

انگلستان سے واپسی پر عنایت، صاحب نے ادارت اور طباعت کے جدید طریقوں کے تجربات شروع کئے تو اس سے کوہستان میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے، ان میں ایک مسئلہ یہ بھی شامل ہو گیا کہ کوہستان اب خسارے کی معیشت سے نکل کر منفعت بخش ادارہ بن گیا تھا، عنایت صاحب کا خیال تھا کہ منافع کے اصل حقدار وہ کارکن ہیں جنہوں نے دن رات انتھک محنت کے ذریعہ ادارے کو کامیابی کی اس معراج تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ان کے بعض ساتھی منافع کو خالص اپنا حصہ سمجھتے تھے بات اس حد تک بڑھی کہ مئی ۱۹۶۳ء میں عنایت صاحب نے کوہستان کو خیرباد کہہ دیا۔

عنایت، صاحب تنہا نہ تھے، جب انہوں نے کوہستان سے علیحدگی اختیار کی تو ان کے رفقاء کی ایک، بڑی تعداد بھی کوہستان چھوڑ کر ان کے ساتھ چلی آئی ان میں انتظامیہ عملہ ادارت کے سبھی لوگ شامل تھے، یوں کوہستان کا ایک دور ختم ہوا۔ اگست ۱۹۶۳ء

کی ایک طوفانی شام عنایت صاحب، کے مکان کے صحن میں ایک تن آور بوڑھا درخت طوفانی تھپیڑوں سے لرز رہا تھا، عنایت صاحب کے گرویدہ چند کارکن ان کے ساتھ کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، عنایت صاحب نے اپنے ایک ساتھی سے کہا دیکھو کل تک یہ کتنا مضبوط درخت تھا اب یہ چند لمحوں کا مہمان ہے، اچانک آندھی کا ایک تیز جھونکا آیا اور بوڑھا درخت ایک ہولناک آواز کے ساتھ زمین پر آگرا۔ عنایت صاحب کے ساتھیوں نے حسرت سے کہا اس درخت سے صحن میں بڑی چھاؤں تھی اب کیا ہوگا۔ عنایت صاحب کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں انہوں نے منہ پھیر کر کہا یہ جو نئے پودے ہیں ان ہی میں سے کوئی بڑھ کر اس کی جگہ لے گا۔ یہ عنایت صاحب کی طرف سے پرانے ادارے کی انجام کی پیش گوئی اور نئے ادارے کے قیام کا اعلان تھا۔ عنایت صاحب، کے سب رفقاء نے اس اشارے کو سمجھ لیا چند روز بعد عنایت صاحب نے اس نئے اخبار کی داغ بیل ڈالی جسے آج عنایت صاحب کا ورثہ سمجھا جاتا ہے اور جس کے بانی کی حیثیت سے آج عنایت صاحب کا نام اخبار کی پیشانی پر شائع ہوتا ہے۔

مشرق نے جن نامساعد حالات میں اشاعت کا آغاز کیا ان کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ مشرق لمیٹڈ کا ادا شدہ سرمایہ پچاس ہزار روپے تھا۔ اس سرمایہ سے جو اخبار نکلا وہ پاکستان میں روزانہ ۱۲ صفحات پر شائع ہونے والا واحد اخبار تھا۔ سرمایہ کی کمی، عنایت صاحب کی زیر قیادت ان کے ساتھیوں نے اپنی محنت سے پوری کی۔ عنایت صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا اتنی تیزی سے بڑھا اور خدا کے فضل وکرم سے اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوگئیں کہ اب وہ ملک کا دوسرا بڑا اخبار اور چاروں صوبوں کے دارالحکومتوں سے شائع ہونے والا واحد قومی اخبار ہے اس قدآور

اور مضبوط درخت کے سایہ میں اب ایک ہزار سے زائد کارکن کام کر رہے ہیں اور بالواسطہ طور پر ہزاروں افراد کی روزی اس عظیم صحافتی ادارے سے وابستہ ہے۔

مشرق نے اخبار کی ادارت، خبروں کی ترتیب و تدوین، اخبار کے صفحات کی تزئین و آرائش، نئے موضوعات، اور خصوصی فیچروں کے انتخاب اور پیش کش کے معاملہ میں جس نئی چیز کو اختیار کیا آہستہ آہستہ تقریباً تمام اخبارات، نے اس کی تقلید کی مشرق عنایت صاحب کے خواب کی تعبیر ضرور ہے، لیکن فی الحال اسے ان کے مشن کی تکمیل کہنا مناسب نہ ہوگا۔ گزشتہ سال ٹیلی ویژن کے لئے ایک انٹرویو میں ان سے سوال کیا گیا کہ آپ مشرق کی کامیابی سے پوری طرح مطمئن ہیں، عنایت صاحب نے جواب دیا تھا "میں اردو زبان میں جو مکمل اخبار بنانا چاہتا تھا۔ وہ تو نہ بن سکا اس راہ میں بعض ایسی دشواریاں ہیں جنہیں ہم عبور نہیں کر سکے۔ تاہم اس حد تک مطمئن ہوں کہ مشرق دوسرے اخبارات کے مقابلہ میں اس حد تک بہتر اخبار ہے کہ اسے بہت قلیل مدت میں بہت زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشرق کی موجودہ اشاعت، آمدنی اور اس کے کارکنوں کے معاوضے اور شرائط کار اس کا ثبوت ہیں۔ عنایت صاحب نے کہا میں ذراسی کامیابی پر مطمئن ہو جانے کا قائل نہیں۔ ہمیں خوب سے خوب تر کے لئے کوششیں کرتے رہنا چاہیئے۔

عنایت صاحب کو اخبار کے انتظامی اور تکنیکی معاملات میں جو مہارت حاصل تھی اس کا اعتراف اخباری صنعت سے وابستہ تمام اہم افراد نے کیا ہے۔ بلاشبہ اس پہلو سے وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی صحافت میں اظہارِ خیال کی آزادی، اور معاشرے میں اعلیٰ اصولوں اور اقدار کے تحفظ کے سلسلہ میں صحافت کے کردار کے پہلو سے بھی عنایت صاحب بے لچک رویہ کے حامل تھے۔ وہ جس چیز کو

معاشرے کے لئے نقصان دہ سمجھتے اپنے اخبار کے ذریعہ اس کی مزاحمت کرنے کے معاملہ میں کسی سمجھوتے پر مشکل ہی سے تیار ہوتے تھے۔

عنایت صاحب اربابِ اقتدار سے ملنے جلنے سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔ جب تک کوہستان میں رہے اس قسم کی ملاقاتوں کا معاملہ نسیم حجازی کے سپرد تھا اور جب مشرق کے مینیجنگ ڈائریکٹر بن گئے تو یہ موقف اختیار کر لیا کہ ایڈیٹر اور صحافتی عملہ کے دوسرے ارکان ہی اس کام کے لئے موزوں ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اربابِ اقتدار کسی بات پر ناراض ہوتے تو ان کی یہ خواہش رہی کہ عنایت اللہ ان سے ملاقات کرے اور معاملات کو درست کرنے کی درخواست کرے لیکن عنایت صاحب نے کبھی ان کی اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ ایک آدھ واقعات تو ایسے بھی ہیں کہ بعض حضرات نے صرف عنایت صاحب کو ملاقات پر آمادہ کرنے کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کیا لیکن پھر بھی انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک مرتبہ اس قسم کی غلط فہمی مغربی پاکستان کے گورنر نواب امیر محمد خاں کالاباغ کے ساتھ بھی ہو گئی۔ عنایت صاحب بعض اربابِ اقتدار کے رویہ سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ حضرات اپنی غلطی پر نادم ہونے کی بجائے عنایت صاحب کو دوسرے طریقوں سے "قابو" کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ ۶۵ء کی جنگ کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت ملک سے باہر جانے کے لئے نو آبجکشن سرٹیفکیٹ ضروری تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور عنایت صاحب کو سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ عنایت صاحب کے رفقا نے چاہا کہ وہ بھاگ دوڑ کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیں لیکن انہوں نے منع کر دیا اور کہا کہ گھٹیا لوگوں کے ہتھکنڈوں کا علاج یہ ہے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی ناکامی پر خود ہی جلتے اور کڑھتے رہیں۔ اسی

دوران میں نواب کالاباغ کے ملٹری سیکرٹری نے عنایت صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ نواب صاحب آپ سے کل دس بجے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ عنایت صاحب نے اس مُلاقات کو این اوسی کے مسئلہ سے متعلق تصوّر کیا اس لئے ملٹری سیکرٹری سے کہہ دیا کہ میں لاٹ صاحب سے ملاقات کا خواہش مند نہیں ہوں۔ اس معاملے نے کافی طول کھینچا لیکن عنایت صاحب گورنر سے ملاقات پر آمادہ نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ بعض مشترکہ دوستوں کے ذریعے نواب کالاباغ نے پیغام بھیجا کہ میں نے اخباری صنعت میں آپ کے کامیاب تجربات کے متعلق بہت کچھ سُنا تھا۔ اس کے علاوہ یہ دیکھا کہ دوسرے بہت سے لوگ محض اس بنا پر خواہ مخواہ آپ کی مخالفت کرتے ہیں کہ وہ آپ کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس لئے میں ذاتی طور پر ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے یاد دلایا کہ کافی عرصہ قبل ایک مجلس میں جب کہ وہ خود گورنر نہ تھے، عنایت صاحب سے ان کی سرسری ملاقات ہو چکی تھی لیکن اس وقت معلوم نہ تھا کہ یہ شخص اتنا کامیاب اخبار نویس اور اتنا اچھا منتظم ہے اس لئے خیال ہوا کہ ایسے آدمی سے ملنا چاہیئے اور اب آپ نے گورنر سے ملاقات کے معاملہ میں بے نیازی کا مظاہرہ کیا ہے اس نے میرے شوق کو اور بڑھا دیا ہے اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ ضرور میری دعوت قبول کریں۔ اس پیغام اور دوستوں کے اصرار پر عنایت صاحب نواب کالاباغ سے ملنے گئے۔ اگرچہ اس خوشگوار ملاقات کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے اور نواب کالاباغ بھی اس کے بعد ان کی تعریف کرتے تھے لیکن عنایت صاحب کبھی دوبارہ نواب صاحب سے نہ ملے۔ ایک مرتبہ کسی دوست نے پوچھا تو کہنے لگے ہمیں اپنے کام سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ گورنروں اور وزیروں کے پیچھے پھرتے رہیں۔

عنایت صاحب کی یہ بے نیازی اور جرآت مندی نہ صرف ان کی کامیابیوں کا سبب تھی بلکہ اس کی وجہ سے ان کے رفقائے کار اور شاگردوں میں بھی ایک غیر متزلزل اعتماد

پیدا ہوتا تھا۔ اپنے فیصلوں اور ارادوں کے تحفظ اور اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کے مفادات کی نگرانی کے معاملہ میں وہ بڑے سے بڑے دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے عادی تھے۔

عنایت صاحب بھی بہرحال انسان تھے اور ہمارے معاشرے کی کمزوریاں اور مجبوریاں جس حد تک دوسرے لوگوں کو متاثر کرتی ہیں ان پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں، لیکن جہاں کہیں اور جس حد تک انہوں نے دباؤ کا مقابلہ کیا، ان کے مرتبہ کے دوسرے لوگوں کو میں نے کم ہی اس سطح تک مقابلہ کرتے دیکھا ہے۔ کاروبار میں اگر کسی بالادست آدمی نے انہیں مالی مفادات کے ذریعہ دبانا چاہا تو انہوں نے ایسے مفادات پر ایک لمحہ میں لعنت بھیج دی۔

بطور صحافی ان کی جرأت کے واقعات بے شمار ہیں، لیکن میں دو واقعات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو ایوب آمریت کے دور میں ان کے کردار کی پختگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان انتخابی معرکہ شروع ہوا تو مادرِ ملت مہم کے آغاز ہی میں ملتان پہنچیں۔ اس وقت تک حکومت کی طرف سے یہ ہدایات جاری ہو چکی تھیں کہ انتخابی مہم میں ایسی تقریروں کو نمایاں نہ کیا جائے جن میں صدر ایوب کی ذات پر حملے کیے جائیں اور جہاں تک اصولی باتوں کا تعلق ہے انہیں اعتدال اور توازن کے ساتھ شائع کیا جائے اور سرخیاں لگانے کے معاملے میں مخالفانہ نکات کی بجائے اپوزیشن کے اپنے پروگرام کے متعلق مثبت چیزوں کو نمایاں کیا جائے لیکن محکمہ اطلاعات کے افسر اپنے طور پر جو ہدایات جاری کرتے تھے وہ ان اصولی ہدایات کے برعکس بعض اوقات انتہائی مضحکہ خیز ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ فلاں جلسہ کی کارروائی کو بالکل شائع نہ کیا جائے اور ان کی اصطلاح میں "بلیک آؤٹ" کیا جائے یا KILL کر دیا جائے۔

پورے ملک کے صحافی اس تکلیف دہ اور متضاد صورتِ حال سے دوچار تھے۔ مادرِ ملت جب ملتان پہنچیں تو لاکھوں افراد نے ان کا فقیدالمثال استقبال کیا۔ اس استقبال کی خبر مشرق میں

اختصار کے ساتھ شائع کی گئی لیکن عنایت صاحب نے اس کے ساتھ ایک تصویر کا انتخاب کیا جس میں بے شمار افراد سٹیشن پر پلیٹ فارم کے جنگلوں میں آہنی شیڈ اور آس پاس کے درختوں پر چڑھے ہوتے تھے۔ اس تصویر کی اشاعت پر فوری طور پر تو کوئی ردّ عمل نہیں ہوا۔ تاہم تین چار روز بعد جب محکمہ اطلاعات کے سربراہ نے جن کی گرفت اخبارات پر بہت سخت تھی کراچی میں بعض مالکان اور مدیران اخبارات سے مادرِ ملت کی انتخابی مہم کی خبروں کی اشاعت کے سلسلہ میں باز پُرس کی تو انہوں نے صحافی کی حیثیت سے فریقین کی خبروں کی اشاعت کے سلسلہ میں اپنا موقف بیان کرنے کی بجائے بیک زبان یہ شکایت کی کہ ٹرسٹ کے اخبارات سے محکمہ اطلاعات کوئی باز پُرس نہیں کرتا اور "آزاد" اخبارات پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مشرق میں شائع ہونے والی ملتان کی تصویر کو بطور نمونہ پیش کیا۔ اس وقت آزاد پریس کے مالکان اگر اس معاملہ میں عنایت صاحب جتنی عقل و جرأت سے کام لیتے تو شاید ایوب آمریت سے انتخابات ہی میں نجات مل جاتی۔ لیکن انہوں نے دوسروں پر ذمہ داری ڈالنے کی آسان روش کو پسند کیا۔ اس کے برعکس جب عنایت صاحب سے ان تصاویر کی اشاعت کے سلسلے میں پوچھا گیا تو انہوں نے پوری ذمہ داری قبول کرتے ہوتے کہا کہ اخبار کو ان ہزاروں قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنا تھا جو اس استقبال میں خود شریک تھے اور کوئی اخبار نویس ایسی صورت میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اخبار کے پبلشر یعنی پریس ٹرسٹ کی ہدایات کے تحت واقعہ کو ایسے انداز میں شائع کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی جو حقائق پر مبنی ہو۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ایوب آمریت کے آخری دَور میں ہوا جب محکمہ اطلاعات کے ایک افسر نے یہ حکم جاری کر دیا کہ وائی ایم سی اے ہال میں منعقد ہونے والے جس جلسہ سے ذوالفقار علی بھٹو خطاب کرنے والے ہیں اس کی خبر کا مکمل بلیک آؤٹ کیا جاتے اور ایک سطر بھی شائع نہ

کی جائے۔ راقم الحروف نے محکمہ اطلاعات کے افسر سے عرض کیا کہ جس جلسہ میں ہزار ہا افراد شریک تھے، نہ صرف ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بلکہ مال روڈ پر بھی ہجوم کی وجہ سے تین گھنٹہ تک ٹریفک جام رہی، اسے اخبار کے صفحات سے کس طرح غائب کیا جاسکتا ہے تو انہوں نے کہا کہ جو کوئی اس خبر کو چھاپے گا وہ ملازمت سے ہاتھ دھو لے۔ اخبار میں اس جلسہ کی خبر دو کالمی سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تو متعلقہ افسر نے بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اگلے روز مرکزی وزیر اطلاعات اور سیکرٹری اطلاعات لاہور میں موجود تھے۔ ان کے سامنے معاملہ پیش ہوا اور شکایت کرنے والے افسر کو یہ سن کر پشیمانی ہوئی کہ عنایت اللہ صاحب نے کہا ہے کہ خبر کو شائع کرنے کے ذمہ دار افراد نے ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض انجام دیا ہے۔ اگر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہے تو اس سے پہلے خود مینجنگ ایڈیٹر کے خلاف کارروائی کرنی ہوگی۔ عنایت صاحب کے اس فیصلہ کے بعد معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ عنایت اللہ مرحوم کے کردار کا یہی پہلو تھا جس نے ان کے رفقائے کار میں وہ عزم، اعتماد اور استقلال پیدا کر دیا تھا جس کے سہارے انہوں نے قلیل سرمایہ اور وسائل کے ساتھ جاری ہونے والے اخبار مشرق کو ایک عظیم ادارے کی شکل دی۔

محمود ہاشمی

دُنیائے صحافت کا کولمبس

ممتاز ادیب، صحافی اور ماہرِ تعلیم محمود ہاشمی عنایت اللہ مرحوم کے زمانۂ طالب علمی کے دوست اور رفیق رہے ہیں، اس کے بعد جب عنایت صاحب نے لندن سے ہفت روزہ مشرق کا اجرا کیا تو انہوں نے اس کی ادارت کے فرائض محمود ہاشمی کو ہی تفویض کئے تھے۔ اس طرح ہاشمی صاحب کو میدانِ صحافت میں عنایت صاحب کی خلاقانہ انتظامی صلاحیتوں کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مشرق کے فیچر رائٹر ریاض بٹالوی نے ان سے عنایت صاحب کی شخصیت کے بارے میں خصوصی انٹرویو لیا۔

سوال:۔ آپ عنایت اللہ مرحوم کے دیرینہ رفیق ہیں اور انہوں نے آپ کے ساتھ مل کر برطانیہ سے پہلا اردو اخبار مشرق جاری کیا تھا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے عنایت صاحب کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں۔

جواب:۔ میں عنایت اللہ کو محض صحافی نہیں سمجھتا کیونکہ انہوں نے کبھی روایتی انداز میں کالم نویسی، اداریہ نگاری، نیوز ایڈیٹری یا رپورٹنگ نہیں کی۔ صحافی کی عام اصطلاح کے مطابق وہ "جاب مین" نہیں تھے بلکہ جاب مینوں کے نگرانِ اعلیٰ تھے، وہ کام کرنے سے زیادہ کام لینا جانتے تھے جو کسی اخبار میں بذاتِ خود بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ وہ رپورٹر

کو بتانے کہ فلاں خبر کہاں سے اور کیسے حاصل کی جا سکتی ہے، وہ نیوز ایڈیٹر کو سمجھاتے کہ اس خبر کو کیسے نمایاں اور موثر بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کالم نگار کو بتاتے کہ کالم کا موضوع کیا ہونا چاہیئے، وہ سوچتے کہ اداریہ نویس کو کسی مسئلہ پر کیا موقف اختیار کرنا چاہیئے وہ خیال رکھتے تھے کہ صفحات کو کیسے بنایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ گویا اخبار کی ترتیب و تدوین، طباعت واشاعت اور فروخت تک وہ صحافت کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھے میرے خیال میں ایسے شخص کو محض صحافی تو نہیں کہا جا سکتا۔

بے شک عنایت صاحب میں لکھنے کی خوبیاں بھی موجود تھیں اور جب بھی انہوں نے کچھ لکھا بہت موثر اور خوب صورت انداز میں لکھا، ان میں بلا کی نیوز سینس تھی اور وہ اداریئے کالم اور فیچر کو دلکش پیرائے میں ڈھالنے کا فن خوب جانتے تھے۔ وہ چاہتے تو جاب مین کی حیثیت سے اچھے اداریہ، کالم نویس، کالم نگار اور نیوز ایڈیٹر بن سکتے تھے، مگر وہ پرفیکشن اور ہمہ گیری کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اعلیٰ منتظم اور اچھا ایڈیٹر بننا پسند کیا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ صحافی سے زیادہ صحافی گر تھے۔ انہوں نے متعدد اخبار نکالے، بہت سے افراد کی تربیت کی اور بہت سے اخبار نویس پیدا کئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو شخص "بادشاہ گر" ہوتا ہے وہ خود بادشاہ بننا پسند نہیں کرتا۔

سوال:۔ عنایت صاحب اگر صحافی نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

جواب:۔ یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ عنایت اللہ اگر صحافی نہ ہوتے تو زندگی کے کس شعبے میں کامیابی حاصل کرتے؟ میں انہیں لڑکپن سے جانتا ہوں اور ان کی بچپن کی دلچسپیوں اور شوق سے واقف ہوں، ہم گوجرہ کے ایک سکول میں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے عنایت اللہ کے سوا کوئی دوسرا لڑکا باقاعدگی سے اخبار پڑھتا ہو، عنایت اللہ اپنے جیب خرچ سے دو یا تین اخبار روزانہ

خریدتے تھے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں حالاتِ حاضرہ اور واقعاتِ عالم سے آگاہ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اخبار میں چھپی ہوئی بہت سی خبریں اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھیں جب کہ عنایت اللہ ان خبروں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے اور ان کا پس منظر بیان کرتے۔ آج محسوس ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اور شعوری طور پر اپنے ساتھیوں سے بہت آگے تھے اور بعض اوقات ہم ان کے آگے طفلِ مکتب نظر آتے تھے۔ وہ اخبار پڑھتے تھے، محفلیں منعقد کرتے تھے۔ دوستوں سے سیاسی گفتگو کرتے تھے اور اپنے جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتے تھے۔ جوانی میں جب انہیں موقع ملا تو لاشعور میں دبی ہوئی خواہش عالمِ شعور میں آ گئی اور وہ اخبار نویس بن گئے۔ بہرحال اگر وہ صحافی نہ بھی ہوتے تو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرتے جس کا تعلق تحریر، طباعت اور اشاعت سے ہوتا۔ اب وہ اخباری ادارے قائم کرتے تھے، تب وہ کتاب گھر یا اشاعتی ادارے بناتے، اب وہ اچھے اچھے اخبار نکالتے تھے، تب وہ عمدہ عمدہ کتابیں شائع کرتے، صحافت کے میدان میں انہوں نے صحافی پیدا کئے۔ پبلشر بن کر ادیب و شاعر پیدا کرتے۔

سوال :- آپ کو عنایت صاحب کی شخصیت کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ بعض لوگ ان کی کم گوئی اور کم آمیزی کو خود پسندی پر محمول کرتے تھے اور کچھ لوگ انہیں پُراسرار آدمی سمجھتے تھے، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

جواب :- جی ہاں بعض لوگ عنایت اللہ کو پُراسرار آدمی سمجھتے تھے اور کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ دوسروں کی شخصیت کو مسخر کر لیتے تھے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ سیدھے سادے اور سچے کھرے انسان تھے اور یہی ان کی جادوگری اور یہی ان کا سحر تھا۔ ہاں بعض اوقات وہ خاصے پُراسرار نظر آتے تھے لیکن ان کی شخصیت کا یہی اسرار ان کی ذات کا حُسن اور شخصیت کا جادو بن گیا تھا۔ میں نے اس اسرار کا سراغ لگانے کے بعد

یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ اپنی منزلیں اور مقاصد متعین کرنے کے باوجود ان کی نشاندہی نہیں کرتے تھے۔ وہ منزل کے حصول میں سرگرداں ہوتے تھے۔ مقاصد کی تکمیل کے لئے تیاریوں کا سامنا کرتے تھے۔ اس وقت اپنے ساتھیوں اور ہم صفروں کو چند مسکراہٹوں اور لمحاتی خوشیوں سے اس طرح بہلاتے رکھتے تھے کہ کسی کو یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ ابھی کتنا فاصلہ باقی ہے اور قافلہ کس سمت جا رہا ہے۔ لوگ ان کی مسکراہٹوں اور خاموشیوں کی بھول بھلیوں ہی میں گم رہتے کہ انہیں اچانک پتہ چلتا کہ وہ منزلِ مقصود پر آ پہنچے ہیں اور عنایت اللہ نے غیر محسوس انداز میں انہیں بہت کچھ دے دیا ہے۔ اس بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مرحوم کی یہ ادا ہی ان کی ذات کا سحر تھا اور اس جادو کا اثر ہر باصلاحیت شخص قبول کر لیتا تھا۔

سوال:۔ عنایت صاحب نے متعدد ادارے چھوڑے اور متعدد اخبار نکالے، کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ (PERPECHONIST) تھے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہتے تھے؟

جواب:۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ وہ ہر چیز کو بامِ عروج پر پہنچانے کے قائل تھے اور اس نصب العین کی خاطر نقش بناتے اور مٹاتے رہتے تھے۔ ایک اخبار نکالتے تھے لیکن جب یہ اخبار اُن کے تصورات پر پورا نہیں اترتا تو اسے چھوڑ کر نئے تجربے میں مصروف ہو جاتے۔ کوہستان کو انہوں نے مکمل اخبار بنانے کی کوشش کی لیکن جب ایسا نہ کر سکے تو "مشرق" نکال لیا۔ مشرق کا آغاز اس دعوے سے ہوا تھا کہ یہ ایک مکمل اخبار ہوگا۔ مگر زندگی کے آخری دنوں میں وہ مشرق سے بھی پوری طرح مطمئن نہ تھے، زندگی وفا کرتی تو شاید وہ ایک اور اخبار نکالتے مگر موت نے انہیں اس تجربے کی مہلت نہ دی۔ مجھے یقین ہے کہ مشرق کے بعد اگر وہ کوئی اخبار نکال بھی لیتے تب بھی خوب سے خوب تر کی

جستجو ختم نہ ہوتی۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ تکمیل کی آرزو میں جس ادارے کو چھوڑتے تھے اسے ہی بہتر بنا سکتے تھے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ بجا مگر عنایت اللہ بنیادی طور پر حسن کار اور تخلیق کار تھے۔ اور کوئی بھی خالق جب اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوتا تو وہ پرانے ڈھانچے پر نئی عمارت تعمیر نہیں کرتا بلکہ نئی بنیادیں اور نئے سانچے بناتا ہے۔ پرانے نقش و نگار کی نوک پلک تو درست کی جا سکتی ہے لیکن مصور کی نگاہ میں وہ مکمل قرار نہیں پاتا۔ عنایت اللہ بیک وقت حسن کار اور حسن شناس تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹائی باندھنے کا خوبصورت انداز انہوں نے ہی مجھے سکھایا تھا۔ ٹائی اچھی نہ ہوتی تو پھینک دیتے تھے اور کہتے تھے نئی لاؤ۔ ہوٹل میں میلے برتن کو اٹھوا دیتے اور جب بیرا وہی برتن دھو کر لاتا تو کہتے دھویا ہوا برتن نئے کا بدل نہیں ہوتا اسے واپس لے جاؤ اور دوسرا لاؤ۔ غالباً اسی ذوق کا اعجاز تھا کہ وہ صحافت کو صنعت تسلیم کرنے کے باوجود ذہنی طور پر صنعت کار نہ بن سکے، ان کی تمام تر دلچسپی اخبار کو معیاری، خوب صورت اور دیدہ زیب بنانے پر مرکوز رہی، وہ مالیات کو ثانوی درجہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اچھی اور خوب صورت چیز ہی بکتی ہے، اخبار بیچنا چاہتے ہو تو اسے پڑھنے والوں کے لئے قابلِ قبول بناؤ اور اس پر محنت کے ساتھ ساتھ سرمایہ لگاؤ۔

سوال:۔ عنایت صاحب بڑی پہلودار شخصیت کے مالک تھے آپ ایک دوست کی حیثیت سے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب:۔ پہلودار شخصیت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اس سے قطع نظر میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ باہر جو کچھ تھے اس سے کہیں زیادہ اپنے اندر تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ اکثر و بیشتر اپنی ذات کے خول میں چھپے رہتے تھے اور اس خول کی کئی تہیں ہوتی تھیں، اسی لئے وہ ایک ادارے کے منتظم ہوتے ہوئے اس ادارے کے کارکنوں کے

دوست تھے، ایک وقت میں اگر وہ آمرِ مطلق نظر آتے تھے تو دوسرے لمحے ان کی جمہوریت پسندی فضا کا تمام کھچاؤ، گھٹن اور خوف دُور کردیتی تھی۔ وہ مجلس لگاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ ان سے بڑھ کر کوئی مجلسی نہیں ہے اور جب اپنے گرد تنہائی کا حصار باندھتے تو دوستوں کو بھی اجنبی نظر آنے لگتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی ذات کے نظر نہ آنے والے نقوش ان خاکوں سے کہیں بڑھ کر دل کش اور خوب صورت تھے جو نظر آتے تھے۔ دیکھنے والے انہیں ایک نظر دیکھ کر پہلا تاثر یہی قائم کرتے تھے کہ یہ سراپا ایک ایسے شخص کا ہے جو صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے، دوسروں کے مسائل سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، مشینی زندگی گزارتا ہے اور کائنات کی دلچسپیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا لیکن اس کے برعکس جن لوگوں کو اس کے اندر جھانکنے کا موقع ملا ہے انہیں وہاں کتنی روپ نظر آتے ہیں۔ ہمدرد، شفیق، غمگسار، دردمند، دوست نواز اور ملنسار گویا کہ عنایت اللہ کے اندر اور بھی کتنی عنایت اللہ موجود تھے۔

سوال :۔ کیا یہ درست ہے کہ عنایت صاحب اپنے مسائل میں کسی کو شریک نہیں کرتے تھے اور اسی لئے انہوں نے زندگی کا بیشتر حصّہ اتنی خاموشی سے گزار دیا کہ لوگ انہیں جانتے تک نہیں ؟

جواب :۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنی ذات میں گم رہتے تھے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کہ وہ اپنے مسائل میں دوسروں کو شریک نہیں کرتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انہوں نے شراکت کی ایک حد اور ایک معیار مقرر کر رکھا تھا اور وہ معیار یہ تھا کہ "میری خوشیوں میں تو ساجھ کر سکتے ہو مگر دکھوں کو بانٹنے کی اجازت نہیں ہے" تجربہ شاہد ہے کہ ان کی ذاتی خوشی ہوتی یا کاروباری مسرت، جب تک چار دوست اور معتمد ساتھی جمع نہ کر لیتے انہیں چین نہ پڑتا، جب کہ پریشانی اور بیماری میں قریب ترین لوگوں کو بھی پتہ نہ چلنے دیتے تھے

کہ ان پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ بہت حد تک ہوا تو یہ کہہ دیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا حالات درست نہیں اس کے آگے وہ کچھ نہیں کہتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی انہیں کمزور، بے بس اور لاچار سمجھے۔ اپنی ذات میں گم رہنے کا یہ انداز آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کا سحر بن گیا تھا لیکن جب وہ کبھی اس خول سے باہر نکلتے تھے تو ساتھیوں کے لئے کوئی پیغام اور کوئی خوش خبری لے کر آتے تھے۔ میں ان کی اس حالت کو دیکھ کر اکثر کہتا تھا کہ عنایت اللہ سوچوں کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن دوسروں کے لئے موتی تلاش کر رہا ہے۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے کہ عنایت صاحب (ملکیت کا تصور) نہیں رکھتے تھے اسی لئے انہوں نے اپنے لئے کوئی جائداد نہیں بنائی۔

جواب:۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ان میں ملکیت کا تصور نہیں تھا بلکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ ان میں جذبۂ ملکیت شدید تھا۔ دراصل ہم ملکیت کو مادی تصور سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے زن، زر اور زمین کے پیمانوں سے جانچتے ہیں۔ مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ذاتی انا، مہر و محبت، شخصی وقار اور عزتِ نفس بھی انسان کی عزیز ترین متاع ہوتی ہے۔ اور وہ اس متاع سے زیادہ سے زیادہ مالا مال ہونے کے خواہاں تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو اسی لئے اپنے گرد جمع رکھتے تھے کہ اس طرح ان کی محبت کے احساسِ ملکیت کی تسکین ہوتی رہے، وہ اپنے اور ساتھیوں کے درمیان اس لئے حدِ ادب قائم رکھتے تھے کہ ان کی ذاتی انا کی متاع برقرار رہے، وہ ہر شخص کے لئے الگ الگ مقام متعین کر دیتے تھے کہ ان کا شخصی وقار قائم رہے، وہ اپنے لئے آزاد اور خود مختار دنیا اس لئے چنتے تھے کہ ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ ملکیت کے اس تصور نے انہیں بہت حد تک اجارہ دار بنا دیا تھا، وہ اخبار پر تو اپنا حق نہیں جتاتے تھے مگر یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ان کے

ساتھی ان کے دائرہ محبت سے باہر نکل جائیں' انہیں کپڑے لتے' مکان اور ساز و سامان سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر وہ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کی انا کو ذرا بھی ٹھیس پہنچائے یہی ان کا سرمایہ اور یہی ان کی ملکیت تھی۔

وہ وفاداری پر بہت زور دیتے تھے اور ہمیشہ کہتے تھے کہ وفاداری شرط ایمان ہے اور جو شخص اپنے گرد و پیش کا وفادار نہیں وہ ہر ایک سے بیوفائی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ان کی ملکیت کے اس احساس کو چیلنج کرتا تھا وہ انتہائی برہم ہو جاتے تھے۔ اور اس تصور کو قائم رکھنے کے لئے انتہائی اقدام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے منطقی طور پر وفاداری کائنات کی بہت بڑی سچائی ہے اور انہیں اس سچائی کا گہرا احساس تھا مگر عنایت اللہ وفاداری پر اس لئے بھی زور دیتے تھے کہ اس طرح ان کی ملکیت محبت کا تصوّر پختہ ہوتا تھا۔ بہرحال ایسا انسان نہ صرف مخلص اور دیانت دار ہوتا ہے بلکہ دوسروں کے لئے بے پناہ قربانی اور ایثار بھی کرتا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ چاہے جانے کا جذبہ رکھنے والا خود بھی چاہنے والا ہوتا ہے۔ اور اپنی چاہت میں محبّت کے سوا سب کچھ تیاگ دیتا ہے۔ مثال سامنے ہے کہ کوہستان سے ان کی علیحدگی کا سبب محبت کی ملکیت کا جذبہ ہی بنا۔ تعمیر کو اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو' اور "مشرق" کی مینجنگ ڈائریکٹری سے بار بار اس لئے استعفیٰ دیتے تھے کہ ان کا شخصی وقار قائم رہے' وہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بہت فخر سے کہتے تھے کہ "یہ سب میرے ہیں" اور اپنا بیت کا یہ تصور ان کی ذاتی انا کی تسکین کا باعث بنتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی خاموشی' ان کی تنہائی کا راز یہی تھا کہ وہ اپنی ملکیت کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور اس سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لئے سوچوں کے حصار قائم کرتے رہتے تھے۔

سوال :۔ عنایت صاحب کو جدید صحافت کا بانی سمجھا جاتا ہے' انہوں نے بڑے

بڑے اخباری ادارے قائم کئے اور انہیں کامیابی کے ساتھ چلایا لیکن وہ خود گمنام کیوں رہے، انہوں نے دوسرے اخبارات کے سربراہوں کی طرح سامنے آنا کیوں پسند نہیں کیا۔

جواب:۔ یہ درست ہے کہ وہ کبھی سامنے نہیں آتے اور ان کی کامیابیوں کا کریڈٹ بظاہر دوسرے لیتے رہے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ عنایت اللہ فوج کے سپہ سالار کی طرح ایسے قائد تھے جو آگے آگے نہیں چلتا بلکہ عقبی مورچے میں بیٹھ کر لشکر کی کمان کرتا ہے، وہ حکمتِ عملی بناتا ہے، ہدایات دیتا ہے۔ آگے بڑھنے کے راستے دکھاتا ہے۔ اور فتح و شکست کا اسی کے فیصلوں پر انحصار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کمانڈر اگر لانچنگ پیڈ پر آن کھڑا ہو تو وہ یہاں آ کر گولی تو چلا سکتا ہے مگر فوج کو پیچھے ہٹنے، آگے بڑھنے، حملہ کرنے اور شبخون مارنے کی ہدایات نہیں دے سکتا اور پھر کمانڈر آگے رہے یا پیچھے ظاہر ہو یا غائب، ہر صورت میں فتح و شکست کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے، فوجوں نے میدان مار لیا تو وہ فاتح کہلایا، ہار گئیں تو شکست اسی کے کھاتے میں لکھی گئی، اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو عنایت اللہ کے پس منظر میں رہنے کے باوجود لوگ کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر باندھتے ہیں۔ وہی جدید صحافت کے بانی کہلاتے ہیں اور وہی کامیاب اور نامور صحافی قرار پاتے ہیں اور ہاں اگر وہ سامنے آجاتے تو اداریہ نویس اور ایڈیٹر کی حیثیت سے تو شاید نام پا جاتے مگر محسنِ صحافت کبھی نہ کہلاتے۔

حسن عابدی

خواتین کا محسن

مشرق کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۶۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اُس روز شہر میں اس نئے اخبار کی دھوم تھی۔ اتنا مکمل اور منفرد اخبار اس سے پہلے لوگوں کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اس کے بارہ صفحات تھے۔ حالانکہ اُن دنوں اُردو روزناموں کی ضخامت چھ اور آٹھ صفحات سے زائد نہ ہوتی تھی۔ بارہ صفحات پر اخبار چھاپنا ایک ایسی سعادت تھی جس کا مستحق صرف انگریزی زبان کے روزناموں کو سمجھا جاتا تھا۔ خبروں کے طومار کو اُردو میں منتقل کر کے بارہ صفحات کا پیٹ بھرنا اوّل تو یوں بھی مشکل نظر آتا تھا، دُوسرے اس وقت اردو روزناموں کے پاس تھا کیا، جس کے لئے اس ضخامت کا اہتمام کرتے۔ پھر اُن دنوں تو یوں بھی اخبارات کی آزادی محدود تھی اور ہر طرح کا مواد شائع کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا جو اخبار شائع ہو رہے تھے، وہ آمریت کی عطا کردہ اصلاحات اور بنیادی جمہوریت کے فیوض و برکات کے ہی تذکرے کو قارئین کے لئے کافی سمجھتے تھے۔

تمہید ذرا طویل ہو گئی، لیکن اس کے بغیر پوری بات بیان نہیں کی جا سکتی۔ قصّہ یہ ہے کہ بارہ صفحات کا جو روزنامہ شائع ہوا اس میں پہلی بار ایک پورا صفحہ

خواتین کے اخبار کا تھا۔ یوں تو اخبار میں بہت سی باتیں چونکا دینے والی تھیں لیکن خواتین کا اخبار سب سے زیادہ حیران کن تھا۔ پہلے شمارے کی اشاعت سے ہفتے دس دن پہلے عنایت اللہ صاحب مرحوم نے جب اخبار کی ترتیب و تدوین کے لئے اپنی "ٹیم" کو کام پر لگایا اور کہا کہ اس میں خواتین کا اخبار بھی ہوگا تو سبھی لوگ چونک پڑے۔ حیرت یہ کہ پورا صفحہ ہوگا اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ کہ ہر روز ہوگا۔ جس کارکن کو اس کام پر لگایا گیا، اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ لیکن عنایت اللہ صاحب مرحوم کا کمال یہ تھا کہ کارکن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے رگ و پئے میں بجلی بھر دیتے تھے، اور اس میں بے پناہ خود اعتمادی پیدا کر دیتے تھے۔ پھر اس شخص کے لئے دُنیا کا کوئی کام مشکل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اخبار کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا۔ عنایت اللہ صاحب مرحوم کہتے تھے کہ آنے والا دَور خواتین کی صحافت کا دور ہے۔ ہمارے اخبارات نے مُلک کی نصف آبادی کو اور اس کے مسائل و معاملات کو بہت دنوں تک نظر انداز کئے رکھا ہے، اب یہ نہیں ہوگا اور آپ دیکھیں گے کہ آج جس کام کی طرح آپ ڈال رہے ہیں، کل سبھی اخبار اس کی تقلید کریں گے۔ ان کا کہا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ دوسرے روزناموں کو بھی اپنی اشاعت اور مقبولیت برقرار رکھنے کے لئے خواتین کا اخبار نصف یا ایک چوتھائی صفحہ کے برابر، بُرا بھلا جیسا بھی بن سکتا تھا شروع کرنا پڑا۔

عنایت اللہ صاحب نے ہمیں بتایا کہ اخبار کا کام محض خبر رسانی نہیں ہے اور نہ لگے بندھے پیرائے میں تبصرہ نویسی اور حاشیہ آرائی ہے۔ اخبار ہماری پوری معاشرت پر اور زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہوتا ہے، لہٰذا اس میں معاشرے کی

پوری کیفیت نظر آنی چاہیئے۔ آپ ذرا دیر کے لئے اپنے معمولات پر نظر ڈالئے۔ معاشرے کا پہلا یونٹ آپ کا کنبہ ہے۔ آپ اس کنبے کے ایک فرد ہیں۔ عورت اس کی تمام سرگرمیوں کا محور ہے۔ اس کی صحت پر کنبے کی صحت مند زندگی بچّوں کی تندرستی، ان کی تربیت اور رہنمائی کا انحصار ہے۔ عورت مرد کی رفیق، اس کے جذبات اور احساسات میں شریک اور زندگی کی کامیابیوں اور مہموں میں اس کی معاون ہے۔ عورت کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے بچّوں کو تعلیم دے سکے۔ اور مطالعے سے باسلیقہ زندگی گزارنے کے اصول سیکھ سکے۔ عورت کو صابر، حوصلہ مند معاملہ فہم، متحمل مزاج اور خوش تدبیر ہونا چاہیئے تاکہ شوہر اس سے خوش رہے، عزیز و اقارب اس کے سلیقے کا دم بھریں، بچّے مطمئن اور خوش و خرم رہیں اور بہ اعتبارِ مجموعی پُورا معاشرہ اخلاق، شائستگی اور خوش تدبیری کی صفات سے آراستہ ہو۔

یہ باتیں ہم نے پہلے بھی سنی ہوں گی، لیکن عنایت صاحب کی طرح سوچا نہیں تھا اور نہ یہ سمجھتے تھے کہ اخبار سے ان باتوں کا رشتہ جوڑا جا سکتا ہے، ایک آدھ مضمون تو مرتب ہو سکتا ہے، لیکن خواتین کا اخبار اور وہ بھی ہر روز کا اخبار کیسے مرتب کیا جائے، بہرحال یہ ایک مسئلہ تھا۔ اس کے لئے طے پایا کہ رپورٹر ان اداروں میں جائے جہاں خواتین کام کرتی ہیں۔ ان سے ملے، ان کے مسائل معلوم کرے اور انہیں اخبار میں شائع کرے۔ ان کی جدوجہد کی تفصیلات مرتب کر کے چھاپے۔ ان کی لائقِ تقلید زندگی کو قارئین کے لئے بطور مثال پیش کرے، تاکہ دوسری خواتین کو بھی اصلاحِ احوال کی ترغیب ہو، اب جو خواتین کا اخبار چھپ کے آیا تو واقعی پڑھنے کی چیز تھا۔ اس سے پہلے سرکردہ خواتین کے نام محض سیاست کے حوالے سے اخباروں میں شائع ہوتے تھے اور عام عورتوں کو لائقِ توجہ نہیں سمجھا گیا تھا کہ یہ حقیر

اور بے نام" ہستیاں اخبار کے لائق کیسے ہو سکتی تھیں، لیکن لوگوں نے دیکھا کہ یہ اسکولوں کی استانیاں، یہ نرس، یہ لیڈی ہیلتھ وزیٹر، ریڈیو کی اناؤنسر، کالجوں کی طالبات، پروفیسر، لیڈی ڈاکٹر اور مختلف پیشوں کی ماہر اخبار کے کالم کی شخصیات بن سکتی ہیں، کیونکہ وہ معاشرے کی ستون ہیں، وہ گھر میں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہوتی ہیں اور گھر سے باہر مختلف اداروں کی فرض شناس کارکن۔ ان کی زندگیاں دوسری عورتوں کے لئے مثال بن سکتی ہیں، ایسی عورتیں جو اپنے گھریلو فرائض بھی سلیقے سے ادا نہیں کرتیں۔

ان دنوں خواتین کا اخبار، ایسے اداروں کی سرگرمیوں سے لبریز ہوتا تھا، جنہیں کبھی لائقِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً عورتوں کے رفاہی ادارے، کارکن خواتین کے دستکاری مرکز، گرلز گائیڈ، معذور بچوں کے تربیتی اسکول وغیرہ۔ گرلز اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیوں کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں، ان کے مذاکرے اور مباحثے، ان کے ڈرامے اور کھیل کود، یہ سب خواتین کے اخبار میں پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ ایک مقبول کالم "ایک خاتون کی ڈائری" ہوا کرتا تھا، جس میں عورتوں کو بہتر زندگی گزارنے کی ترغیب دی جاتی تھی، گھر سے معاشرے تک، اس ڈائری کا کینوس بہت وسیع ہوتا تھا۔ اسی اخبار میں عورتوں کو اپنی صحت بحال رکھنے، بہتر لباس سینے اور پہننے اور اپنے حُسن کی حفاظت کے قرینے سادہ اور دلنشیں انداز میں بتائے جاتے تھے، بچوں کی تربیت کے اصول بھی اس میں شامل ہوتے۔ ایک مزیدار کالم "آج کیا پکائیں؟" تھا، یہ سوال ہر گھر میں ہر خاتون کو صبح ناشتہ کی میز پر درپیش ہوتا ہے، کم خرچ، متوازی اور خوش ذائقہ غذا، جو کنبے کی صحت کی ضامن ہو۔ بہر حال ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس کالم میں خواتین کو کھانے پکانے کے سلسلے میں مشورے دیتے جاتے تھے۔ غرضیکہ "خواتین کا اخبار" ایک مکمل گائیڈ ہوتا تھا۔ اس کی پیشانی پر ویسے تو یہ عبارت درج

ہوتی ۔ خواتین کا اخبار، جسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن مرد اسے بالالتزام پڑھتے تھے۔

خواتین کا اخبار جب پابندی سے شائع ہونے لگا تو اخبار کے لئے نئی لکھنے والیاں نکل آئیں۔ ان میں سے چند پختہ کار صحافی بن گئیں، لیکن اصل فائدہ، گھر میں بیٹھی ہوئی ان خواتین کو ہوا جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد خانہ داری کے بکھیڑوں میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہی تھیں۔ انہوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ گھر کی ذمہ داریاں اپنی جگہ لیکن انہیں سلیقے سے سرانجام دینے کے بعد کچھ وقت لکھنے پڑھنے کے لئے بھی نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ ان دنوں خواتین کی ڈاک میں دُور افتادہ قصبات کی عورتوں کے مضمون، خاکے، زنانہ سرگرمیوں کی رپورٹ اور عام دلچسپی کے کالم، کچھ غنیمت لیکن بیشتر ٹوٹے پھوٹے پیرائے میں لکھے ہوتے موصول ہونے لگے۔ اس طرح مشرق اکثر گھروں کا پسندیدہ اخبار بن گیا۔ اس سے پہلے اخبار صرف کُنبے کے سربراہ یا مردوں کے مطالعے کی چیز سمجھا جاتا تھا، لیکن جب مشرق خواتین کے اخبار کے ساتھ شائع ہونے لگا تو اندازہ ہوا کہ اخبار تو سب کے لئے ہوتا ہے، عورتوں کے لئے بھی، اسکول کی بچیوں کے لئے بھی، بڑی بوڑھیوں کے لئے بھی، بچّوں کے لئے بھی۔ چنانچہ ان دنوں ایسی مثالیں بھی سننے میں آئیں کہ کسی کُنبے کے سربراہ نے کسی وجہ سے اپنے مطالعے کے لئے کوئی اور اخبار منتخب کرنا چاہا تو بچّوں نے "بھوک ہڑتال" کر دی اور عورتوں نے صاف کہہ دیا کہ آپ جو چاہیں پڑھیں، لیکن ہمیں ہمارا اخبار ملنا چاہیئے۔

یہ عنایت اللہ صاحب کی ذہانت اور فراست، ان کی پیش بینی اور صلاحیت کار کا اعجاز تھا کہ انہوں نے اخبار کو روایتی ڈگر سے نکالا اور اسے کُنبے کے ہر فرد کی ضرورت، مشاورت، رہنمائی، تربیت اور تفریح کے لئے ایک ضروری چیز بنا کر پیش کیا۔

خواتین کا اخبار نہ صرف خواتین میں بلکہ عام قارئین میں بھی خاصا مقبول ہوا۔ اسی

مقبولیت کے پیشِ نظر عنایت اللہ صاحب مرحوم نے اپنے تجربے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور کراچی سے اخبارِ خواتین کے اجرا کا اعلان کیا۔ اخبارِ خواتین میں انہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر اظہار و بیان تک متعدد تجربے کئے۔ خواتین کے اس نئے مجلّے کے ساتھ اس مفہوم کا اعلان کہ اسے سمجھ دار مرد بھی پڑھ سکتے ہیں" ایک لطیف اشارہ تھا، چنانچہ خواتین کا یہ پہلا مجلّہ تھا، جسے مردوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ زنانہ پرچے تہذیبِ نسواں کے دَور سے لے کر زمانۂ حاضر تک خاص بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں، لیکن ان پر مَردوں کی پسندیدگی کی چھاپ نہ لگ سکی، حالانکہ کشیدے اور کروشیے کے نام اور نئے نئے پکوان کے علاوہ کہانیوں اور ادبی تحریروں کا انتخاب، جو عام قارئین کے لئے پُرکشش ہو سکتا ہے، ان جرائد میں بالالتزام چھپتا رہا ہے۔ دراصل اخبارِ خواتین نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اخبار کو صرف اخبار سمجھا اور اسے ماہناموں کی گھسی پٹی روش سے بچائے رکھا۔ قارئین کے مذاق اور مطالبوں سے مفاہمت بھی کی، لیکن اخباریت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سماجی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی موضوعات اور زمانۂ حاضر کے مسائل، جن میں خواتین کی رہنمائی ضروری ہوتی ہے، اخبارِ خواتین میں زیرِ بحث آتے رہے، پھر مضامین کی پیش کش کا اسلوب اور ان کے بیان کا انداز اتنا دو ٹوک، صاف ستھرا اور گنجلک عبارت اور حشو و زوائد سے پاک رہا کہ قارئین اس کا پہلا ہی شمارہ دیکھ کر پھڑک اٹھے اور دیکھتے دیکھتے اس کی سرکولیشن ۵۵ ہزار تک جا پہنچی۔

عنایت اللہ صاحب مرحوم بلاشبہ اُردو صحافت میں ایک طرزِ خاص کے بانی ہیں اور خواتین کی صحافت پر ان کا احسان غالباً سب سے زیادہ ہے، کیونکہ انہوں نے جدید صحافت میں ان موضوعات کو رواج دیا جنہیں اخبارات نے لائقِ توجہ نہیں

سمجھا تھا۔ اُن کے طرزِ فکر میں اور اسلوبِ بیان میں اتنا توازن تھا، اتنی نرمی اور لطافت تھی، اتنی سادگی اور مفاہمت تھی، جس نے ان کے قارئین کو ہمیشہ اپنا گرویدہ بنائے رکھا اور ان کا بڑا احسان یہ تھا کہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کی، نئے صحیفہ نگاروں کی (اور ان میں خواتین بھی شامل ہیں) نہایت خاموشی کے ساتھ اور غیر محسوس انداز میں تربیت کی

کرنل مسعود

میرا رقیب، میرا رفیق

دستور کے مطابق جناب عنایت اللہ سے ہماری دشمنی ہونی چاہیئے تھی لیکن ہوا یہ کہ ساری عمر ہماری ایک دوسرے کی عزت و تکریم میں گزر گئی۔

جناب عنایت اللہ سے دشمنی ایک تو ہم محض نالائقی کی وجہ سے نہ کر سکے۔ غالب کی اس بات میں اگرچہ ایسی باتوں سے آسمان مُفت میں دشمن ہو جاتا ہے۔ ہم نے دانائی اور کسی ہنر میں یکتائی سے دامن کو ہمیشہ پاک رکھا ہے۔ دشمنی کے مضمون میں تو ہم اتنے کمزور تھے کہ اگر کہیں اس کے امتحان میں ہمیشہ بیٹھنا پڑ جاتا تو ہم "نقل مار کر" بھی پاس نہ ہو پاتے۔ پھر عنایت اللہ تو انسان بھی ایسا تھا کہ کسی ڈھب سے دشمنی کرنے بھی تو نہیں دیتا تھا۔ جس شخص کے چہرے پر آپ کو دیکھتے ہی ایک سہانی سی مسکراہٹ کوندجاتے اس سے آپ دشمنی کیا کریں گے۔ ایک آدھ کوشش کوئی کرتا بھی تو اسے یہی محسوس ہوتا کہ اس شخص سے دشمنی کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے۔

جناب عنایت اللہ سے ہمارا پہلا آمنا سامنا ہی ہوا تو کاروباری رقابت میں بہ ۴۹-۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ ہم لوگوں نے راولپنڈی سے ایک اخبار نکالنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت تک یہ کسی کو نہیں سوجھی تھی کہ راولپنڈی سے بھی روزانہ اخبار نکالا جا سکتا ہے، بلکہ لاہور

کے باہر کہیں سے بھی، ہم سمجھے کہ یہ ہمارا زبردست "سکوپ" ہوگا۔ (اس "مہم" میں جناب ضمیر جعفری، میں اور ایک اور سابق فوجی افسر شامل تھے)، ہم نے اخبار نکالنے کی تیاریاں شروع کر دیں، بڑے طمطراق کی تیاریاں۔ اخبار کا نام ہم نے "بادشمال" تجویز کیا تھا، لیکن ہمارا "ڈیکلریشن" ابھی سرکاری فائلوں کی بھول بھلیاں ہی طے کر رہا تھا کہ راولپنڈی سے روزنامہ "تعمیر" طلوع ہوگیا اور پیشتر اس کے کہ "بادشمال" کی سرسراہٹ بھی محسوس ہو سکے "تعمیر" نے پوری "منڈی" پر قبضہ کر لیا۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی ہم جنگ ہار چکے تھے۔

ہمیں شکست دینے کی "سٹریٹیجی" جناب عنایت اللہ ہی کی تیار کی ہوتی تھی۔ مثلاً ہم نے اپنا دفتر مال روڈ پر سجایا تھا جو صاحب لوگوں کی گزرگاہ تھی اور وہ بھی اس زمانے کے صاحب لوگوں کی جن کی پتلون اگر اردو اخبار سے چھو جاتے تو اسی روز اتار کر اسے وہ ڈرائی کلیننگ کے لئے بھیج دیں۔ اس کے برعکس عنایت اللہ صاحب نے اپنا دفتر شہر کے عین وسط میں جامع مسجد روڈ پر جمایا۔ عین عوام میں، جہاں سے پچاس ہزار لوگ روز گزرتے اور وہ بھی "اردو بولو، اردو لکھو، اردو پڑھو" قسم کے لوگ۔ پھر انہوں نے "تعمیر" کے دفتر کے باہر بڑا سا ایک بورڈ لگوا دیا جس پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تازہ بتازہ خبروں کی سرخیاں لکھی جاتیں، جنہیں دیکھنے کے لئے لوگوں کے جھرمٹ لگے رہتے۔ اس سے بھی زیادہ "دکانداری" انہوں نے یہ کی کہ "ٹیلی پرنٹر" کی مشین انہوں نے بازار کی طرف لگا دی جسے ہر آتا جاتا دیکھ سکے۔ راولپنڈی کے لوگوں نے یہ تماشا پہلے کہاں دیکھا تھا! لوگ آتے اسے دیکھتے اور جا کر دوسروں کو بتاتے "تعمیر" کو پوسٹر لگانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

عنایت اللہ کے "تعمیر" نے ہمارے "بادشمال" کو ہر شعبہ میں مات دی، ماسوا اسے شاعری کے شعبہ کے۔ حالاتِ حاضرہ اور راولپنڈی کے مقامی مسائل پر جناب ضمیر جعفری کی بڑے معرکے کی نظمیں چھپتیں لیکن کوئی روزنامہ معرکے کی مزاحیہ نظموں کے سہارے نہیں چل

سکتا۔ چنانچہ پانچ چھ ماہ سسک سسک کر "بادِ شمال" نے آخر دم توڑ دیا اور ہم لوگ اپنی اور چند دوستوں کی پونجی ڈبو کر پھر نوکری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ جناب عنایت اللہ سے ہمارا "دوستی کا سفر" اس طرح شروع ہوا۔

"رقابت" کے ان ایام میں بھی جناب عنایت اللہ سے ملاقات ہوتی تو کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ کسی "غیر" سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اس وقت بھی وہ بہت ہی "اپنے" لگتے تھے۔ یہ "اپناپن" ان کے ساتھ یوں چپاں تھا کہ کسی "میجر اپریشن" ہی سے اسے جُدا کیا جا سکتا۔ بعد میں تو جس عہدے پر ہم تھے اس کے فرائض منصبی ہی کا تقاضا تھا کہ ہم سب اخبار والوں کی عزت و تکریم کریں لیکن جناب عنایت اللہ کی عزت و تکریم کے لئے ہمیں اپنے فرض کا سہارا لینے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ "آف ڈیوٹی" بھی ان سے یہی رشتہ رہا۔ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں اور قابلیتیں ہی ایسی تھیں کہ صحافت کے فن سے آشنائی رکھنے والا ہر شخص ان کی عزت و تکریم پر مجبور تھا البتہ یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ ہماری عزت و تکریم کیوں کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ بچارے اپنی عادت سے مجبور تھے ان سے کوئی بھی ملتا وہ ملاقات میں اتنا خلوص اور محبت گھول دیتے کہ ان سے ملاقات کی شیرینی بڑی دیر تک زائل نہ ہوتی۔ اسی لئے تو آج اتنی خلقت ان کا سوگ منا رہی ہے۔ ہر طبقے کے لوگ، صحافی، غیر صحافی، پڑھے لکھے، غیر پڑھے لکھے، بڑے لوگ، چھوٹے لوگ، اونچے اونچے کاموں والے، لمبے لمبے ناموں والے اور وہ بھی جن کا کوئی نام نہیں ہوتا، وہ محض چپڑاسی ہوتے ہیں یا دفتری یا مالی یا ڈرائیور یا خانساماں۔

عنایت اللہ صاحب کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ چھوٹے بڑے، ہر ایک سے صلاح لیا کرتے تھے۔ دفتری اور مستری سے بھی اور شعبہ کے انچارج سے بھی۔

ایک بار ایک مانے ہوتے صحافی "مشرق" کا سرورق تیار کر کے انہیں دکھانے کے

لئے لاتے۔ جناب عنایت اللہ کے پاس اس وقت سیلز سپروائزر بیٹھا ہوا تھا جسے صحافت کا ماہر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ مانے ہوتے صحافی سے جناب عنایت اللہ نے کہا کہ سرورق آپ انہیں دکھائیں۔ انہیں آپ کا اخبار بیچنا ہے، یہی آپ کے سرورق کو صحیح طور پر پرکھ سکتے ہیں۔ سینئر صحافی نے اس میں اپنی کچھ سبکی محسوس کی لیکن عنایت اللہ صاحب نے جلد ہی انہیں قائل کر دیا کہ سمجھ اور دانش کسی خاص طبقے کی میراث نہیں۔ پریس کا مستری بعض اوقات آپ کو ایسا نکتہ سمجھا دے گا جو آپ صحافت کے نصاب میں نہیں ڈھونڈ سکتے۔

اخبار کا "ہاکر" جناب عنایت اللہ کے لئے اتنی ہی اہم شخصیت تھا جتنا اخبار کا چیف سب ایڈیٹر جب تک ان کی صحت ساتھ دیتی رہی راولپنڈی اور لاہور میں وہ منہ اندھیرے اخبار کے ساتھ خود "مارکیٹ" جاتے۔ ایک ایک ہاکر سے ملتے۔ اس روز کے "ایڈیشن" کی خوبیاں اسے بتاتے اور عام طور پر وہ اسے چند زائد کاپیاں اٹھانے پر آمادہ کر لیتے۔

عنایت اللہ صاحب کے ساتھ جن لوگوں نے کام کیا ہے وہ ان کی باتیں کرتے کرتے آپ کو "بور" کر دیں گے۔ کس طرح وہ دفتر سب سے پہلے پہنچ جاتے اور سب سے بعد میں اٹھتے۔ کس طرح اخبار کی ہر غلطی کو وہ اپنے سر لیتے لیکن اگر کوئی تعریف کی بات ہوتی تو وہ متعلقہ شخص کے سر پر گویا سہرہ باندھ کر اسے سارے دفتر میں گھماتے اور ایک ایک شخص کے سامنے اس کی تعریف کرتے کہ دیکھئے اس نے کتنی اچھی خبر دی ہے یا کتنی اچھی سُرخی لگائی ہے یا کتنا اچھا فیچر لکھا ہے یا کتنی اچھی تصویر بنائی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جناب عنایت اللہ صاحب کی جتنی باتیں ہیں سب کی سب اخبار کے "ریپر" میں لپٹی ہوتی ہیں۔ سکول کے ابتدائی ایام کے عنایت اللہ کو بھی اس کے استاد جناب ممتاز مفتی صاحب نے دکھایا ہے تو وہ بھی اخبار کا ایڈیٹر بننے کے خواب دیکھتے ہوتے۔ کیا عنایت اللہ کو اخبار سے باہر نکال کر کوئی ہمیں نہیں دکھا سکتا؟ گھر میں بال بچوں سے کھیلتے ہوتے، بیوی

سے بحث کرتے ہوتے ٹیلیویژن پر بھونڈا اشتہار دیکھ کر جھنجھلاتے ہوتے' کیا زندگی میں انہوں نے کوئی ایک پورا روز اخبار سے جُدا ہو کر گزارا تھا؟ مثلاً چڑیا گھر یا عجائب گھر میں گھومتے ہوتے یا چراغاں کا میلہ دیکھتے ہوتے یا بازیگروں کا تماشہ دیکھتے ہوتے. کیا انہیں گانا سننے کا شوق تھا؟ اگر شوق تھا تو کس قسم کا گانا سننے کا. کیا وہ روشن آرا بیگم' استاد شریف خان پونچھ والے اور استاد نزاکت علی خاں سلامت علی کی محفل میں خوش ہوتے یا اقبال بانو' فریدہ خانم اور غلام علی کی محفل میں' یا کیا انہیں رونا لیلیٰ' تصور خانم اور مسعود رانا کی قسم کی گائیکی پسند تھی کیا ان کا بچپن کا کوئی ساتھی بتائے گا کہ اس زمانے میں وہ اخباروں کے "میک اپ" ہی کے خاکے سوچتے رہتے تھے یا ہماری طرح آم یا خربوزے یا گنّے چراتے ہوتے کبھی وہ پکڑے گئے اور مار بھی کھائی. کیا انہوں نے زندگی کی شاعری بھی کبھی لکھی یا "نثر داری" ہی کے دن گزر گئے. کیا کبھی کسی سے ان کی لڑائی بھی ہوئی. کبھی کوئی قانون توڑا، ٹریفک کا قانون ہی سہی' کبھی کسی سے غچہ کھایا؟ ایسے بہت سے سوال ہیں جن کے جواب ان کے تذکرے میں نہیں ملتے۔

ہمیں پتہ ہوتا کہ ہمیں جناب عنایت اللہ پر کبھی مضمون لکھنا پڑے گا. تو ہم زندگی ہی میں ان سے یہ سوال پوچھ لیتے لیکن حساب کے مطابق اس کا امکان کوئی نہ تھا. ان کی اور ہماری عمر کا جو تناسب تھا اس کے اعتبار سے انہیں ہم پر مضمون لکھنا چاہیئے تھا خواہ اسے کوئی بھی نہ چھاپتا. ان کی "بیماریت" مسلّم تھی لیکن ہمیں خیال یہی ہوتا تھا کہ انہوں نے اسے اپنی شخصیت کا ایک جزو بنا رکھا ہے. شاید اس لئے کہ اس طرح اپنی سرگرمیوں کو صرف اخبار تک محدود رکھنے کا انہیں بہانہ مل جاتا تھا. پھر کراچی اور لاہور کے درمیان ان کا آنا جانا رہتا ہی تھا. یہ تو پتہ ہی نہ تھا کہ اس دفعہ جو لاہور جائیں گے تو ادھر ادھر میں سے وہ آگے کو چل کھڑے ہوں گے. یوں ان کی تصویر کا ایک رُخ کچھ دھندلا سا

رہ جاتا ہے۔ایک بات تو واضح ہے۔ زندگی میں انہیں اس سوال نے کبھی زچ نہیں کیا کہ "میں منجی کتھے ڈاہواں"! ان کے دل میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا کہ انہوں نے "منجی" کہاں "ڈاہنی" ہے۔ اخبار کے پریس میں عین مشینوں کے اوپر، مشینوں کا شور ہی ان کے لئے لوری کا کام دیتا تھا۔ زندگی میں انہوں نے اتنے لوگوں کے ساتھ بھلائی کی ہے کہ اب وہ جہاں ہیں، اللہ کے کرم سے وہاں بھی انہیں "منجی ڈاہنے" کا سوال پریشان نہیں کر رہا ہوگا جو لوگ ایمان پر قائم رہے اور اللہ کی مخلوق سے جنہوں نے بھلائی کی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کیسی "منجیوں" کا اہتمام کر رکھا ہے؟ ایک ہی سورۃ میں دو جگہ ان کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ فُرُشٍ بَطَائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ اور مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ٥

شورش کاشمیری

معمارِ صحافت

عنایت اللہؒ نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز لے کر پیدا ہوتے تھے۔ آغاز میں "کوہستان" آخر میں "مشرق" ان دونوں کا رختِ سفر اس میرِ کارواں کے پاس یہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عنایت اللہ نے اردو اخبار نویسی کو پاکستان میں ایک نئی شاہراہ دی۔ یہ زمانہ خوبیوں کے اعترافات کا نہیں۔ بعض لوگوں نے "انجمنِ ستائش باہمی" بنا رکھی ہے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی ثناخوانی کرتے ہیں۔ ان میں محاسن نہ بھی ہوں تو وضع کر لیتے ہیں۔ عنایت اللہؒ ثناخوانی کی ایسی تمام تقریبوں سے محروم رہے اور ان کی رحلت کے بعد ان کا جو حق تھا ہم نے ادا کرنے میں بخل کیا۔ تو اس کے وجوہ ہیں ورنہ عنایت اللہؒ نے صحافت کو ایک نیا جلوہ دیا اور اخبار نویسوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جو قلم کے میدان کی مسافر تو تھی لیکن ہیرو نہ تھی۔ قدرت نے انہیں عجیب دل و دماغ دیا تھا۔ اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے انہوں نے اپنی ٹیم خود منتخب کی، وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو دوسروں کے سہارے پرواز کرتے ہیں۔ ان کا افق بھی اپنا تھا اور ان کے رفقا بھی اپنے ہی تھے۔ ان کے سفر کی پہلی منزل "کوہستان" تھا۔ اس میں کوئی رفیقِ قلم یا شریکِ نظم ایسا نہ تھا جو پہلے خارستانِ صحافت میں رہا ہو۔ تقریباً سبھی نوجوان تھے اور نئے

تھے حتیٰ کہ نسیم حجازی بھی انہی کی بدولت ناول نگار سے اخبار نویس ہو گئے۔ ابو صالح اصلاحی اور عالی رضوی قلم کار ضرور تھے لیکن عنایت اللہ کی بدولت ایڈیٹر ہو گئے پھر ان کے قلم سے زبان کو شگفتگی اور بیان کو ایسی رونق ملی کہ بعض کہنہ مشق ایڈیٹروں کی تحریریں مقابلتہً کئی دفعہ گجلاتے ہوتے شعلے معلوم ہوتی تھیں۔

"مشرق" نکلا تو "کوہستان" کا آدھا عملہ اُدھر رہ گیا آدھا اِدھر آ گیا۔ "مشرق" دنوں ہی میں جوان ہو گیا۔ اس کی ٹیم میں بعض نئے چہرے بھی آ گئے۔ صورتِ حال مختلف ہوتی تو کسی کا "کوہستان" کے سامنے ٹھہرنا مشکل تھا لیکن عنایت اللہ کے پاس ذہن تھا زر نہیں تھا۔ رفقا تھے تجوریاں نہ تھیں۔ یہ اس کا حوصلہ نہیں معجزہ تھا کہ وہ دیکھتی آنکھوں اتنے بڑے اخبار نکال لیتا اور مسافت کی مشکلوں پر قابو پا لیتا تھا۔ وہ اپنے اخبار کی رُوحِ رواں تھا لیکن اس میں نہ تو سرخیل ہونے کا گھمنڈ تھا اور نہ کوئی اس کے قرب سے خوفزدہ ہوتا وہ اپنے کنبے کا دوست مزاج بزرگ تھا۔ بہ الفاظ اقبال رح ہے

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیتے تھے اندازِ خسروانہ

تاہم اس کے اندازِ خسروانہ، نہ تھے بلکہ قلندرانہ تھے۔ لیکن وہ ایک ایسا انسان تھا جس میں عجم کے حسنِ طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں کا بانکپن تھا وہ اپنے ادارے سے اتنی محبت کرتا تھا جتنی ایک شاعر اپنے تخیل سے کرتا ہے۔ اس نے صحافت کو جو کچھ دیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ اخباروں کو تند آور کیا اور ان میں ایک ایسا ٹھاٹھ پیدا کیا جو اس سے پہلے اُردو اخباروں میں نہیں تھا۔

۲۔ ان کی بدولت اخباروں میں بعض نئے کالم داخل ہوتے جو آہستہ آہستہ تمام اخباروں نے اپنا لئے اور اب ان سے کسی اخبار کو مفر نہیں۔

۳۔ ان سے پہلے اشاعت کے اعتبار سے انگریزی اخباروں کو فوقیت حاصل تھی "مشرق"

نے اس فوقیت کو توڑ ڈالا۔

۴۔ ورکنگ جرنلسٹوں کے مشاہرہ میں اضافہ ان کے دم سے ہوا۔ کسی ورکنگ جرنلسٹ سے معمولی تنخواہ پر کام لینا ان کے مشرب سے خارج تھا۔

۵۔ انہوں نے اخباروں کے مزاج کو اس حد تک عوامی بنا دیا کہ ایک عام انسان محسوس کرنے لگا کہ وہ ان میں شریک ہے۔

۶۔ ان کی بدولت اردو روزناموں میں پہلی دفعہ خبری تصویروں کو جگہ ملی اور مضمون نگاروں کی تصویر بہر مکانے کا لازمہ ہو گئی۔

۷۔ انہوں نے دایاں اور بایاں بازو کی تفریق و تقسیم سے ہٹ کر قومی بنیادوں پر اخبار کی نیو رکھی۔

۸۔ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں نمود سے بے نیاز تھے۔

۹۔ انہوں نے صحافت کے علاوہ سیاست میں بھی کئی ایک نوجوانوں کو اٹھایا جو آج ہماری ملکی و قومی سیاست کا جزو لاینفک ہیں۔

غرض! عنایت اللہ قلمکار تھے یا نہیں؟ لیکن معمار ضرور تھے۔ صحافت میں قلم کی نئی پود پنجاب کی حد تک ان کے التفات کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔

ابنِ انشاء

گنجینۂ معنی کا طلسم

عنایت اللہ، بس خالی عنایت اللہ نہ اس کے ساتھ کوئی سابقہ نہ لاحقہ، نہ سید نہ شیخ، نہ مفتی نہ مولانا، گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند۔ کہ نام کے پیچھے دہلوی، اصفہانی، سمرقندی وغیرہ لکھتا، بس دو لفظوں کا مجموعہ گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے۔

ہمارا ان سے عجیب رشتہ تھا، ان کے ساتھ کھایا پیا، ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے، ان کے ساتھ کام بھی کیا، ان سے زیادہ تر خوش ہوتے، لیکن ایک آدھ بار غائبانہ طور پر ناخوش بھی ہوتے۔ وہ ہماری قدر افزائی بھی کرتے تھے لیکن فی الحقیقت اس خصوص میں جسے اخبار بنانا کہہ سکتے ہیں کہ بنانے کا لفظ سارے شعبوں پر محیط ہے، وہ استاد تھے ہم شاگرد تھے، ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا، اگرچہ اتنا نہیں جتنا چاہیے تھا۔

عنایت اللہ عجب شخص تھا، خوش ذوق، خوش پوش، اس کی ہر بات میں تھی اِک اِک بات، جس میز پر وہ بیٹھا ہو اس کو دیکھ لیجیے۔ کام کا ہجوم، لیکن یہ نہیں کہ میز ہماری میز کی طرح کباڑ خانہ بنی ہوتی ہے۔ بات دھیمے سے اور ملائمت سے، ہمہ وقت تبسم، لوگ اخباروں کو اپنے نام و نمود کا کارخانہ بنایا کرتے ہیں۔ عنایت اللہ کے ساتھ یہ قصہ بھی نہ تھا۔ ہم نے ان کے نکالے ہوئے اخباروں پر ان کا نام نہ دیکھا۔ ایک موقعہ آیا کہ ازراہِ قانون

ان کو نام دینا پڑتا تھا وہ بھی آخری صفحے پر پرنٹ لائن میں، اتنے باریک قلم میں کہ اس سے باریک نز قلم کاتب کے پاس نہ ہوتا اس کے مقابلے میں دوسروں کو ہمیشہ آگے بڑھانے تھے، ان کے نام اصرار کر کے دیتے تھے، جس زمانے میں ہم انجام میں کالم لکھتے تھے۔ پرانے شعار کے مطابق ایک قلمی نام سے کام چلاتے تھے، حاجی بابا اصفہانی، آخر آخر میں حاجی بابا، تصویر دینے کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ ہم نے تصویر کبھی کسی ادبی پرچے کو بھی نہ دی تھی۔ ایک دور ایسا آیا کہ انجام کے حالات کو درست کرنے کے لئے عنایت صاحب کو بلایا گیا مشرق بھی نیشنل پریس ٹرسٹ کا اخبار تھا۔ انجام بھی اس رشتے سے، عنایت اللہ نے پوچھا، یہ کالم کون لکھتا ہے، کسی نے ہمارا نام لیا ہوگا۔ ان دنوں ہم لکھتے بھی ہفتہ میں تین دن تھے۔ عنایت اللہ نے انجام والوں سے کہا تم اچھے لوگ ہو ایک شخص پہلے سے مشہور ہے، اس کے نام سے فائدہ نہیں اٹھاتے، ان سے کہو نام دیں، ادھر ہمیں تامل تھا، تصویر دینے کو بھی کہا گیا۔ اس پر ہم ہرگز راضی نہ تھے۔ آخر نام دینے کی حامی بھر لی۔ تصویر انجام والوں نے کسی گروپ فوٹو سے لے لی۔ چند دن میں خود ہمیں بھی فرق محسوس ہوا۔ ہمیں بھی اچھا لگنے لگا، اب تو ہم کہتے ہیں کہ بھئی ہمارا کالم دو نہ دو، ہمارا نام ضرور دو، ہماری تصویر ضرور چھاپو۔

اخباروں کا مطلب ہمارے ہاں صرف خبریں دینا تھا، کچھ لطیفے لطائف بھی ہوتے تھے، اداریہ ہوتا تھا جس میں ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کو تنبیہیں کی جاتی تھیں کہ راہِ راست پر آجاؤ۔ تم کو آخری موقع دیتے ہیں، پھر نہ کہنا ہمیں خبردار نہ کیا۔ وہ تو خیریت ہوتی کہ یہ اخبار اردو میں تھے اور ملک کے باہر نہ جاتے تھے، ورنہ ہٹلر اور مسولینی واقعی ان کو پڑھ لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ مولانا اختر علی خاں کا قصہ مشہور ہے یہ لندن گئے اور اصرار کیا کہ اٹیلی صاحب سے ملوں گا، ملاقات ہوتی انہوں نے کہا دیکھئے صاحب آپ لوگ کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے ہماری مدد کیجئے ورنہ،

اٹیلی کی آنکھوں کے سامنے تلواریں لہرانے لگیں، دماغ میں بم کے گولے پھٹنے لگے، مسکینی سے ڈرکر بولے ورنہ کیا؟

مولانا نے فرمایا "ورنہ میں زمیندار میں آپ کے خلاف ایڈیٹوریل لکھوں گا۔"

عنایت اللہ اتنی دُور کی باتیں نہیں کرتے تھے، وہ اخبار کو ایک معاشرتی حربہ سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ اپنے گردو پیش کی باتیں کرو، یہ دیکھو کہ اخبار کون پڑھتا ہے اخبار عورتیں بھی پڑھتی ہیں ان کے لئے الگ کالم ہونا چاہیئے۔ جس میں پندو نصیحت کے علاوہ یہ بھی بتاؤ کہ آج کیا کھایا جائے، طالب علموں کے لئے ان کے مطلب کا صفحہ ہونا چاہیئے، مزدوروں اور محنت کشوں کو ان کے کام کی باتیں بتاؤ۔ سیٹھوں اور ساہوکاروں کو اس سے مطلب ہوتا ہے کہ آج کس چیز کا بھاؤ بڑھا، کس کا گرا، تیزی مندی وعدے کے سودے وغیرہ، وہ اخبار کو اپنا ذاتی کھلونا بنانے کی بجائے قارئین کا اخبار بنانے کے قائل تھے، جسے "مکمل اخبار" کا نام دیتے تھے۔

عنایت اللہ نے لے آؤٹ اور اخبار بنانے میں ایسا اسلوب اختیار کیا کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کا موجودہ دور کم از کم قالب کی حد تک عنایت اللہ اسکول ہے ابھی اور بہت کچھ اُن کے ذہن میں تھا وہ اور طرحیں نکالتے، اگر صحت اور زندگی ان کو مہلت دیتی ایک اور اہم جدّت جس میں عنایت اللہ نے کام کیا، سنڈے فیچر تھے، الگ اخبارِ فلم تھا، الگ اخبارِ خواتین تھا، تحقیقاتی جائزے تھے، مقبولِ عام خبروں، قتل وحادثہ وغیرہ کے ڈیسلے کا انداز تھا۔ یہ ہمارے معاصر مغربی انداز تھے جس کا پیوند انہوں نے بڑی ذہانت سے مشرقی صحافت میں لگایا، انہوں نے کوہستان اور تعمیر کو بنایا اور بڑھایا لیکن مشرق ان کی تخلیق تھا، ان کا شباب تھا۔ اس لئے اگر لوگ عنایت اللہ کو "عنایت اللہ مشرق والے" سے جانتے ہیں تو ٹھیک ہی جانتے ہیں۔

مرحوم کی دوسری خوبیوں کا ذکر کیا کیجئے 'دل کو کتنی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں' ان کی بصارت ناقص تھی اور ان کے پھیپھڑے ناقص تھے' بلکہ ایک ہی پھیپھڑا تھا' دوسرا کسی عارضے میں پہلے ہی نکالا جا چکا تھا' پھر بھی یہ شخص سیماب صفت تھا اس کو جسم و جان کی توانائی بھی حاصل ہوتی تو پہاڑوں سے نہریں کھود کے لاتا' اپنے میدان میں اس نے جو کچھ کیا وہ بھی کسی صورت کم نہیں' اردو صحافت کو طرحِ نو اور آہنگ تازہ بخش گیا' ہم عنایت اللہ اپنے دوست کو روتے ہیں کہ چپ چاپ سدھار گیا۔ اور محفلوں کی رونق اپنے ساتھ لے گیا لیکن پھر دیکھتے ہیں کہ وہ کسی ایک کا نہ تھا۔ اس کے اوقات کا کوئی حصہ اس کا اپنا نہ تھا اپنے رفیقوں کا تھا اپنے ادارے کا تھا جو لوگ اس کے ساتھ کام کرتے تھے ان کو رکنِ خاندان جانتا تھا' ان کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک تھا۔ سچ یہ ہے کہ جینے کا لطف یہی ہے ورنہ اپنے لئے تو سب جیتے ہیں' ایسا کچھ کر کے چلو کہ سدا یاد رہے۔

ارشاد احمد خاں

جریدی ایڈیشن

جدید اُردو صحافت میں عنایت صاحب کا وہی مقام ہے جو جدید اردو شاعری میں مولانا حالی کا. برصغیر پاک و ہند میں عنایت اللہ صاحب وہ پہلے صحافی ہیں جنہوں نے اردو صحافت کو عصری تقاضوں اور جدید بنیادوں پر استوار کیا اور زمانے کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترقی کی نئی راہیں نکالیں۔

عنایت صاحب سے میری ملاقات ۱۹۶۱ء میں روزنامہ "انجام" کے دفتر میں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب انجام کی انتظامیہ اخبار کی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں بیحد فکرمند تھی اور کوئی ایسی صورت نظر نہیں آ رہی تھی جو اس اخبار کو آگے بڑھا سکے. چنانچہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین نے عنایت اللہ صاحب سے مشورہ کیا اور ان سے سرکولیشن بڑھانے کا نسخہ تجویز کرنے کی فرمائش کی. عنایت صاحب مرحوم نے انہیں بتایا کہ اخبار میں بعض اہم تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کے سنڈے ایڈیشن کی صورت بھی بدل دی جائے اور بڑے سائز کے بجائے ہفت روزہ رسالوں کے سائز پر جدید تقاضوں کے مطابق "سنڈے انجام" نکالا جائے. ٹرسٹ کے چیئرمین نے نہ صرف اس تجویز سے اتفاق کیا بلکہ عنایت صاحب سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ اپنی نگرانی میں "سنڈے انجام" مرتب کرائیں. عنایت صاحب نے یہ

ذمہ داری قبول کرلی اور چند ہفتوں بعد ہی اس ایڈیشن کی اشاعت بارہ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ اشاعت میں یہ حیرت انگیز توسیع دیکھ کر دوسرے اخبارات نے بھی کچھ اس قسم کے ایڈیشن نکالنا شروع کئے۔ اگرچہ دوسرے اخبارات کے ایڈیشن اتنی کامیابی حاصل نہ کر سکے لیکن کراچی کی صحافت میں پہلی بار جدید بنیادوں پر سنڈے ایڈیشن شائع کرنے کا احساس پیدا ہوا اور صحافت پر عنایت کا یہ بہت بڑا احسان تھا۔ آج ہر اخبار مختلف موضوعات پر ہفتے میں کئی کئی ایڈیشن شائع کرتا ہے جن کی اشاعت روزانہ اخبار سے زیادہ ہوتی ہے ورنہ اس سے قبل یہاں ایڈیشنوں کا رواج نہیں تھا۔ کراچی میں صرف دو روزنامے سنڈے ایڈیشن نکالتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ عام اخبار میں صرف تصویروں کے دو صفحات کا اضافہ کر دیا تھا۔

اخبارات کی ترقی کے لئے اس نئے انداز اور نئی طرز کے فروغ کے علاوہ کارکن صحافی بھی عنایت صاحب کے مرہونِ منت ہیں۔ انہوں نے جہاں صحافیوں کو معقول اُجرت دلانے کے لئے جدّ و جہد کی ہے وہاں ان کی پیشہ وارانہ شخصیت کو بھی ابھارا ہے۔ ایک زمانے میں اکثر اخبارات کے مالکان فرضی ناموں سے کالم اور قطعات لکھا کرتے تھے۔ علامہ پاکٹ مار، رمضانی، ملّا دو پیازہ اور نتھو دھوبی جیسے نام اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس زمانے میں رمضانی کے قلمی نام سے میں فکاہیہ کالم لکھا کرتا تھا۔ عنایت صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے اور انجام کی انتظامیہ دونوں کو ہدایت کی کہ فرضی نام کے بجائے اپنے اصلی نام سے کالم یا مضمون لکھنے کی صورت میں ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے اور لکھتے وقت یہ خیال رہتا ہے کہ مضمون میرے نام سے شائع ہو گا اس لئے کالم نگار زیادہ سے زیادہ بہتر لکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس اگر فرضی نام سے کالم یا مضمون لکھا جائے تو کالم نگار میں ذمہ داری کا وہ احساس باقی نہیں رہتا۔

عنایت صاحب کی اس ہدایت کے بعد میں نے رمضانی کے بجائے اپنے نام سے کالم لکھنا شروع کیا تو وہ پہلے کی نسبت زیادہ پسند کیا گیا۔ جب میں نے مشرق کے لئے پہلا کالم لکھا تو عنایت صاحب نے وہ جناب اقبال زبیری کو دکھایا اور ان سے پوچھا "دیکھئے پہلے کے مقابلے میں کچھ فرق ہے؟" زبیری صاحب نے پورا کالم بڑے غور سے پڑھا اور عنایت صاحب کے خیال کی تائید کی۔

قلم کاروں کی شخصیت نکھارنے کے علاوہ عنایت صاحب کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ صحافیوں کو معاشرے میں باعزت مقام حاصل ہو، وہ خوش پوش اور باوقار نظر آئیں۔ وہ اس اصول کے قائل تھے کہ اخبار کے عملے کے مزاج کا اثر خود اخبار پر بھی پڑتا ہے۔ عملہ شائستہ اور نفاست پسند ہو گا تو اخبار بھی نفیس نکلے گا۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا عنایت صاحب نے مشرق کے ایک کارکن کے لباس کی تعریف کرتے ہوئے کہا "بڑی شو نکالی ہے۔ لیکن کچھ اخبار کی بھی شو نکالو نا!"

عنایت صاحب نے اگرچہ یہ جملہ مزاح کے طور پر کہا تھا لیکن اس میں افادیت کے پہلو تھے، ایک تو یہ کہ عملہ کے وہ فرد جن سے عنایت صاحب ہمکلام تھے اخبار کو دیدہ زیب بنانے کی طرف پوری توجہ دے۔ دوسرے یہ کہ آس پاس عملے کے جو افراد موجود ہیں ان میں بھی اخبار کے لئے زیادہ بہتر طور پر کام کرنے کی لگن پیدا ہو۔

جُرعات

چٹکی، جرمانہ اور پان کی دکان

وہ کمرے میں داخل ہوتے میرے قریب آکر کان میں پوچھا کہ "آج لاہور نامہ میں کوئی چٹکی ہے" میں اس سوال پر سٹپٹایا۔ پھر وہ مکین احسن کلیم سے مخاطب ہوتے "مکین صاحب آج لاہور نامہ میں کوئی چٹکی ہے"۔

اس سوال کو انہوں نے کئی بار دہرایا اور جس بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوتے تھے اسی بے تکلفی سے یہ سوال کرتے کرتے کمرے سے نکل گئے۔

یہ ہمارے عنایت صاحب تھے۔ انہوں نے مجھ پر بہت جرمانے کئے۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ لاہور نامہ میں چٹکی نہیں ہے تو جرمانہ اور اگر کہہ دیا کہ چٹکی تو ہے تو اس پر بھی جرمانہ، عجب طور تھا۔ اس شخص کا کہ نہ کبھی BOSS کی حیثیت سے کالم کے بارے میں ہدایات دیں، نہ نکتہ چینی کی۔ نہ اچھے کلمات نہ بُرے کلمات۔ بس وہ دفتر میں چلتے پھرتے دم بھر کے لئے میرے قریب آکر ٹھہرتے اور کبھی سرگوشی میں اور کبھی بآوازِ بلند کہ سب سُنیں، پوچھتے "آج لاہور نامہ میں کوئی چٹکی ہے"۔

"لاہور نامہ" کی جو وضع بنی اس میں عنایت صاحب کے اس طریقہ کو بہت دخل ہے۔ میں نے کالم اصل میں کسی اور نہج پر شروع کیا تھا۔ مگر عنایت صاحب روز ایک چلتا سا

فقرہ کہہ دیتے کہ لاہور نامہ پان والے کی دکان پر نہیں پہنچا۔ آخر میں نے ادبی مسائل کو چھوڑ چھاڑ ایک عام سی بات پر لکھ ڈالا۔ دوسرے دن دوپہر کو عنایت صاحب نے کمرے میں داخل ہوکر باآوازِ بلند کہا۔ لو جی آج لاہور نامہ پان والے کی دکان پر پہنچ گیا۔ اس اعلان کے ساتھ مجھ پر اچھا خاصا بھاری جرمانہ کیا گیا۔

اس طرح میں نخالص ادبی کالم کے چکّر سے نکل آیا۔ شہر کی عام زندگی اس کالم کا محبوب موضوع ٹھہری اور مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ فقرہ اچھا ہو تو اس کی مار بھاٹی دروازے کے دکاندار تک ہوتی ہے۔

چٹکی کی داستان یہ ہے کہ اس کالم میں جب باوقار ادارے اور معزز شخصیتیں زیرِ بحث آئیں تو بہت شدید ردِّعمل ہوا۔

کی جس کی بات اس نے شکایت ضرور کی۔

مگر ہوا یہ کہ لاہور نامہ کے خلاف جتنی شکایات آئیں اتنا ہی عنایت صاحب لاہور نامہ سے خوش ہوتے چلے گئے۔ اب میں اپنے جال میں آپ پھنس گیا۔ کسی معاملہ میں ذرا نرمی برتی جاتی تو عنایت صاحب چپکے سے آکر پوچھ لیتے کہ لاہور نامہ میں آج کوئی چٹکی ہے یا نہیں؟

یہ چٹکی ایک دن عجیب رنگ لائی۔ میں صبح ہی صبح دفتر میں داخل ہوا تو اصلاحی مرحوم نے مجھے دبوچ لیا۔ "انتظار صاحب آج آپ نے حد کردی۔"

"کیا ہوا؟"

"آپ نے راجہ حسن اختر پہ ہاتھ صاف کردیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ راجہ صاحب ہمارے بہت کرمفرما ہیں اور عنایت صاحب سے ان کی دانت کاٹی روٹی ہے۔ آج تو بہت ہی بُرا ہوا۔"

تھوڑی دیر میں عنایت صاحب آئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ چٹکی کی کوئی بات نہیں کی۔ پھر چلے گئے۔ میں اصلاحی صاحب کے پاس ہی ابھی بیٹھا تھا کہ عنایت صاحب راجہ حسن اختر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے انہیں دیکھا اور آنکھ بچا کر کمرے سے کھسک گیا۔

تھوڑی دیر میں میری طلبی آگئی "چلو عنایت صاحب بُلا رہے ہیں"۔

میں وہاں پہنچا تو عنایت صاحب نے راجہ صاحب سے کہا کہ "راجہ صاحب یہ ہیں وہ صاحب جنہوں نے آپ کے خلاف لکھا ہے۔ آپ ان سے بھگتیئے"۔ یہ کہہ کر عنایت صاحب نے مجھے دھکیل کر اِن کے سامنے کیا اور خود آہستہ سے کمرے سے نکل گئے۔

اس صورت حال میں راجہ صاحب کے لئے بزرگانہ شفقت کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ اور میں بھیگی بلی بن کر مودب ان کی خدمت میں بیٹھ گیا۔ عنایت صاحب تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ فضا کو خوشگوار پا کر خوش ہوئے اور مجھ پر جُرمانہ کر دیا۔

عنایت صاحب کا یہ رویہ لاہور نامہ کو بہت راس آیا۔ اخبار میں لکھنے والوں کے سر پر ایک تلوار ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے کہ صاحبِ اثر اخبار کے سربراہ پہ اثر انداز ہو کر کالم نگار کے قلم پر اثر انداز ہوں گے۔ ایک کالم نگار کے لئے بشرطیکہ وہ آزادانہ لکھنے کی خواہش رکھتا ہو۔ یہ اطمینان بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کے ادارے کا سربراہ اثر رکھنے والوں کے اثر سے کالم کو مجروح نہیں ہونے دے گا۔

نہ نجی تعلقات، نہ ذاتی تعصبات، نہ اُوپر سے آنے والی فرمائشیں، عنایت صاحب کا مسئلہ کالم نگاری کے سلسلہ میں صرف ایک تھا کہ کالم موثر و مقبول ہو اور بامعنی ہو۔ کبھی اگر ان کی طرف سے اشارہ آیا تو اسی حوالے سے آیا۔ مثلاً، ستمبر ۶۵ء کو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ یہ لاہور نامہ تو امن کے زمانے کا تھا۔ جنگ کے زمانے کا لاہور نامہ کیسا ہوگا۔

میں خود اپنے ذہن میں اس بارے میں واضح نہیں تھا کہ دیا کہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ بولے کہ اچھا پھر کالم موقوف، شہر میں گھومو پھرو۔ آج کل، پرسوں۔ پھر خود کالم کی کوئی راہ سوجھے گی۔

مجھے عنایت صاحب کی ایسی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں اور میں ایک حیرت کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ ہم جسے اپنا رنگِ بیان سمجھتے تھے اس میں اس شخصیت کا کتنا حصّہ ہے۔ (انتظار حسین)

فوٹو جرنلزم

یہ ۲۹ ستمبر ۱۹۵۷ء کی رات کا ذکر ہے کہ "کوہستان" کی آخری نیوز کاپی رات ایک بجے پریس بھیجنے کے بعد مسٹر جاوید اور میں ریلوے سٹیشن پر چائے پینے چلے گئے۔ وہاں قلی اور دیگر ریلوے ملازمین گیمبر کے حادثہ کی باتیں کر رہے تھے جہاں تیز گام تباہ ہو گئی تھی اور سینکڑوں مسافر جاں بحق ہو گئے تھے اور یہ بات سُن کر ہم گھبراہٹ میں واپس دفتر پہنچے تو عنایت صاحب پریس جا رہے تھے تاکہ طباعت کے کام کی نگرانی کر سکیں۔ ہماری بات سُن کر ان کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے فوری طور پر اس خبر کے مختلف پہلوؤں اور ان کے نتائج کا اندازہ لگا لیا۔ ان کی جیب خالی تھی لیکن انہوں نے ہمّت نہ ہاری اور فوٹوگرافر مسٹر اقبال زیدی کو بُلا لیا اور انہیں ساتھ لے کر ایک ٹیکسی کے ذریعے گیمبر روانہ ہو گئے اور تمام زخمیوں اور ہلاک شدگان کے فوٹو حاصل کئے اور اگلے روز اپنی نگرانی میں اس کی رپورٹ مرتب کرائی اور تصویروں کے بلاک بنوائے اور آئندہ اشاعت میں مصور اخبار شائع کیا جس سے مُلک بھر میں آگ لگ گئی اور ایک ہی روز میں کوہستان کی اشاعت اپنے ہم عصر اخبارات سے

بڑھ گئی اور جناب عنایت اللہ نے پنجاب میں پہلی بار "فوٹو جرنلزم" کو رائج کیا اور اس کے بعد اخباری صنعت کا نقشہ ہی بدل گیا۔ (عزیز مظہر)

خواتین اور صحافت

عنایت اللہ نے تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے صحافت کے میدان میں جگہ بنائی اور کسی قسم کا تفاوت روا نہ رکھا۔ انہیں بھی وہی حقوق دیتے جو مردوں کو حاصل تھے۔ ان ہی کی بدولت اردو اخبار میں پہلی بار خواتین نے صحافی کی حیثیت سے قدم رکھا اور عورتوں کو بھی مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا عملی موقع ملا۔ ورنہ اس سے قبل یہ عالم تھا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی بھولی بھٹکی خاتون آجاتی تو انہیں دفتر کے ایک کونے میں جگہ مل جاتی جہاں وہ خبروں کی ترتیب و تدوین کرتی اور خاموشی سے چلی جاتی۔ باقاعدہ رپورٹنگ اور اخبارات میں روزانہ خواتین کے صفحے کا اجرا پاکستان کی صحافت میں پہلی مرتبہ عنایت اللہ صاحب کی اپنی اختراع تھی۔ دوسرے اخبارات نے بعد میں گویا ان کی پیروی کی اور یوں میدان صحافت میں مزید خواتین کے لئے ملازمتوں کی راہ ہموار ہوئی۔

عنایت اللہ کہا کرتے تھے کہ زندہ قومیں اپنی خواتین کو نظر انداز نہیں کیا کرتیں۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پاکستانی خواتین میں معاشرتی شعور بیدار ہو۔ "مشرق" اخبار میں خواتین کا صفحہ اسی بنیاد پر رکھا گیا مگر وہ اس سے کبھی بھی مطمئن نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صحافت کے میدان میں خواتین مردوں کے سہارے کے بغیر کام کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کراچی سے ہفتہ وار اخبارِ خواتین نکالا اور اس کی ایڈیٹر بھی ایک خاتون ہی کو بنایا۔ عورت کو میدان صحافت میں لا کر عنایت اللہ صاحب نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ اس کے احترام پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ وہ اپنے کمرے میں خواتین

کی آمد پر ہمیشہ احتراماً کرسی سے اٹھتے تھے۔ جب طبیعت خراب ہوتی تو معذرت کر لیتے۔ مگر عورت کے احترام کے سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ احترام کرانا اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اپنے دفتر کی کارکن خواتین سے انہوں نے ہمیشہ یہ توقع کی کہ وہ لباس اور اطوار میں سادگی اختیار کریں تاکہ وہ زنانہ محفلوں میں جائیں تو خواتین بھی ان کا احترام کریں۔ میں نے کبھی شوخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوتے تو ان کے سامنے جانے سے گریز کرتی۔ انہیں چمکیلی اور بھڑکیلی اشیاء سے نفرت تھی۔ (فریدہ حفیظ)

مطالعہ کا شوق

پاکستان میں صحافت کو انقلابی خطوط پر استوار کرنے اور اخبارات کی دُنیا میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے عنایت صاحب نے سخت ریاضت کی۔ انہوں نے کئی بار مغربی ملکوں کا مطالعاتی دورہ کیا۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ پورے کیرئر کے دوران کم و بیش ڈیڑھ ہزار کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کیا۔ بیسیوں ماہرین سے تبادلہ خیال کیا۔ اور پھر تمام معلومات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھا۔ اس طرح ان کو معلوم ہو گیا کہ فن صحافت کے کون سے اصول عملی اعتبار سے مفید ہیں اور کون سے غیر مفید ہیں۔ عنایت صاحب اگر صرف کتابی علم اور تجربے پر اکتفا کرتے تو شاید انہیں فن صحافت کا امام ہونے کا اعزاز حاصل نہ ہو سکتا۔ ان کی کامیابی کے اہم اجزاء ان کا جرأت مندر دل، تخلیقی ذہن اور غیر متزلزل استقلال و ارادہ ہیں۔ انہوں نے دنیا کے تمام علائق سے بے نیاز ہو کر خود کو اخبارات کی دُنیا تک محدود کر لیا تھا۔ اپنے اخبار کی کامیابی اور توسیع و ترقی ہی ان کی زندگی کا واحد نصب العین قرار پا گیا تھا۔ اس کام میں انہیں اس قدر یکسوئی حاصل ہو گئی تھی کہ اور کوئی خیال ان کے دماغ میں آتا ہی نہ تھا۔ وہ اخبار کی ترقی کے نئے نئے طریقے سوچتے رہتے

تھے۔ جیسے ہی کوئی عمدہ تجویز ان کے ذہن میں آتی اسے فوراً جامہ عمل پہناتے۔ اس مقصد کی لگن میں وہ اس قدر محو تھے کہ کھانے پینے اور سونے کو بھی زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ پورے ۴۸ گھنٹے تک جاگتے اور کام کرتے رہے۔ کام سے اسی دلچسپی کے باعث وہ محنتی کارکنوں سے خوش ہوتے اور انہیں اپنے قریب رکھتے تھے۔ یہ ایک طرح کا امتحان بھی ہوتا تھا جس سے معلوم ہو جاتا کہ ایک کارکن کس حد تک ذمّہ داری کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ قابلِ اعتماد آدمیوں کی قدر کرتے تھے۔ اور جس شخص پر اعتماد کرتے اس کے بارے میں کسی شک یا بدگمانی کا گزر تک دل میں نہ ہونے دیتے۔ وہ اس کو بڑی بڑی ذمّہ داریاں سونپتے اور اس کی پوری استعداد اور وسعتِ قلب و نظر کو اظہار کا موقع دیتے۔ وہ اپنے کارکنوں کو ملازم نہیں بلکہ دست و بازو قرار دیتے تھے اور ان سے دوستوں اور ساتھیوں کی طرح پیش آتے۔ (خالد لطیف)

مالک ہونے کے باوجود کارکن

عنایت صاحب اخبار کا مالک ہونے کے باوجود ایک کارکن تھے۔ اخبار سے متعلق چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اخباروں کے بنڈل تک اپنے کندھوں پر اٹھاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے دفتری کی جگہ کام کیا اور کئی گھنٹے تک اخبار فولڈ کرتے رہے۔ اس حالت میں ان میں اور دوسرے کارکنوں میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کھانا بھی ان کے ساتھ ہی کھا لیتے۔ (طاؤس خان)

اے ۔ رزاق

سات سمندر پار

جینئس، فقر و استغنا اور جُود و سخا کی صفات کم ہی کسی میں یکجا ہوتی ہیں ۔ ایسی نادر روزگار شخصیتوں کے نیاز پُرانی کتابوں کے اوراق میں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وہ شخصیتیں ہیں جن پر زمانہ ہمیشہ ناز کرتا ہے ۔ ہمارے محترم عنایت اللہ بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جو اپنی ذات کے فنا ہو جانے کے باوجود اپنی صفات کی بدولت بقائے جاوداں حاصل کرتی ہے ۔ محترم عنایت صاحب کی ذات مشرق، اخبارِ خواتین اور اخبارِ وطن کی صورت میں زندہ ہے تو صفات، مکرم اقبال زبیری اور ان کے ساتھیوں کی سیرت کا جزو بن کر جاری و ساری ہیں۔

عام قاعدہ ہے کہ لوگ اپنے لئے محفوظ اور سیدھے راستے پسند کرتے ہیں لیکن خاص لوگ گھسی پٹی راہوں پر قدم رکھنے کے بجائے نیا راستہ بناتے ہیں ۔ عام لوگ زرخیز زمین میں بیج بونا پسند کرتے ہیں مگر خاص لوگ لق و دق صحراؤں میں بھی پھول کھلا دیتے ہیں ۔ ہمارے محترم عنایت اللہ بھی اپنی خاص لوگوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔ اردو صحافت کی رُوح جسے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں نے تخلیق کیا تھا وہ ہمارے

زمانے تک جسم کی تلاش میں بھٹکتی رہی جو اسے ہمارے محترم عنایت اللہ نے عطا کیا

یورپ اور امریکہ کی فضائیں اردو صحافت سے نامانوس نہیں ہیں تقریباً پون صدی پہلے تحریک ریشمی رومال کے سربراہ اور آزادیٔ ہند کے بہت بڑے مجاہد امام الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے معتقد ڈاکٹر برکت اللہ نے کبھی پیرس سے، کبھی برطانیہ سے اور کبھی امریکہ سے اردو اخبارات جاری کئے۔ مگر یہ احتجاجی اخبارات تھے جو وطن کی آزادی کے لئے تحریک کرتے تھے۔ جس وطن کی آزادی کے لئے ڈاکٹر برکت اللہ نے احتجاجی صحافت کی بنیاد ڈالی تھی اس وطن کی آزادی کے استحکام کے لئے صحافت کو بروئے کار لانے کا شرف ہمارے محترم عنایت اللہ نے حاصل کیا۔

قیام پاکستان کے وقت ہماری دُنیا اپنی تاریخ کے ایک عجیب دَور سے گزر رہی تھی۔ دوسری عالمی جنگ نے یورپ کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔ یورپ کو اپنی بحالی کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ تو موجود تھے لیکن افرادی قوت کی کمی نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ یہ کمی افریقی اور ایشیائی ممالک کے مزدوروں سے پوری کی گئی۔ ان میں پاکستان سے آنے والے محنت کش بھی شامل تھے۔ یورپ کے بعض صنعتی شہروں میں شاذونادر ہی کوئی پاکستانی دیکھنے کو ملتا تھا لیکن اب چند ہی سالوں میں حالت یہ ہوگئی کہ کم از کم برطانیہ میں پاکستانیوں سے شہر اور محلے بھر گئے۔ پاکستان سے محنت کشوں کی آمد کا تانتا تارکینِ وطن پر پابندیاں عائد ہونے تک جاری رہا۔ ان تارکینِ وطن کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سب سے بڑی اُلجھن تہذیب و تمدن کا فرق تھا۔ پاکستانیوں کی اکثریت نے مغربی تمدن میں ضم ہو جانے سے انکار کر دیا۔ اور یوں معاشرتی تنہائی (SOCIAL ISOLATION) کا ناگ انہیں ڈسنے لگا۔ ان کے بدن تو یورپ میں تھے لیکن دل اور دماغ اپنے وطنِ عزیز میں اٹکے تھے مقامی

زبانوں سے عدم واقفیت کی بنا پر اور کچھ اپنی بے پایاں مصروفیات کی وجہ سے وہ احوالِ وطن جاننے کی تمنا رکھنے کے باوجود اندھیرے میں رہنے پر مجبور تھے۔ آج برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، ڈنمارک، ناروے، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، ترکی اور بحرِ اوقیانوس کے پار امریکہ اور کینیڈا میں بسنے والے لاکھوں پاکستانی ہمارے محترم عنایت اللہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یورپ کے دل لندن سے اردو اخبار جاری کر کے "معلوماتی اندھیرا" دُور کر دیا۔ اور وطن سے جو رابطے منقطع ہو چکے تھے انہیں بحال کر دیا۔ آج یورپ میں بسنے والے پاکستانی اپنے وطن کے لیل و نہار سے اس قدر آگاہ ہیں کہ ذہنی لحاظ سے خود کو آغوشِ وطن میں محسوس کرتے ہیں۔

محترم عنایت صاحب پاکستان کے پہلے اخبار نویس تھے جنہوں نے یورپ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنے لاکھوں ہم وطنوں کے دلوں کی دھڑکن سُنی اور اس پر توجہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم جیسے کوتاہ بینوں کے لئے لندن سے اردو اخبار کے اجرا کا تصوّر ہی مذاق معلوم ہوتا تھا مگر ان کے مزاج آشنا جانتے تھے کہ محترم عنایت صاحب کو صحراؤں میں گل و گلزار کھلانے میں ہی مزہ آتا ہے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ محترم عنایت صاحب "وسائل" کے محتاج نہ تھے بلکہ خود وسائل ان کی محتاجی کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ محترم عنایت صاحب نے چند ہی دنوں میں دیارِ غیر میں محبوس اپنے ہم وطنوں کی ضروریات کا اندازہ لگا لیا اور ایک ہفتہ وار رسالے کا سارا منصوبہ مکمل کر لیا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آسمانِ صحافت کے درخشاں ستاروں کی ضرورت تھی لیکن یورپ میں ان کے حصول کا تصوّر بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ محترم عنایت صاحب نے یورپ سے ذرّے چُنے اور اپنی توجہ سے انہیں ستارہ ہی نہیں آفتاب بنا دیا۔ یوں ۱۹۶۱ء کی پہلی سہ ماہی میں لندن سے ہفت روزہ "مشرق" منصۂ شہود پر آیا۔

لندن سے ایک ہفتہ وار جریدے کا اجرا ایک جرأت مندانہ اقدام تو تھا ہی مگر اصل کام یہ تھا کہ جن لوگوں کے لئے مشرق جاری کیا گیا تھا اسے ان کے ہاتھوں تک کیسے پہنچایا جاتے؟ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ انگریزی اخبارات کے نظامِ تقسیم سے فائدہ اٹھایا جاتے لیکن محترم عنایت صاحب نے اسے اپنے حسبِ حال نہ پاکر مسترد کر دیا اور اس کی جگہ ایک خالصتاً اپنا نظام تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ ان کی دُور بین نگاہوں نے ہر کسی سے پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ پاکستانی عوام اپنی مخصوص عادات خورد نوش کے باعث برطانوی دکانوں پر نہیں جاتے بلکہ انہوں نے ہر اس علاقہ میں جہاں پاکستانی آباد تھے دکانیں کھول رکھی تھیں اور پاکستانی عوام انہیں سے سودا سلف خریدتے تھے۔ عنایت صاحب نے ان "گروسری شاپس" کو نیوز پیپر ایجنسیوں میں بدل دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ان کا اخبار ہر پاکستانی تک پہنچنے لگا۔

اس عہد کی مادہ پرستی کے نوحہ خوانوں کے لئے یہ حقیقت وجہ تسلی ہوگی کہ ابھی کچھ دن پہلے تک ہمارے درمیان ایک ایسی ہستی موجود تھی جسے مادہ پرستی سے دُور کا علاقہ بھی نہ تھا۔ ہمارے محترم عنایت صاحب نے دن رات کی ذہنی اور جسمانی مشقت سے جس اشاعتی ادارے کو جنم دیا تھا اور جسے پہلے ہی دن کاروباری لحاظ سے کامیابی سے ہمکنار کر دیا تھا اس میں سے اپنے لئے ایک پنس لینے سے بھی انکار کر دیا۔ یہ تھی بے غرضی کی وہ صفت جو زمانہ حال میں شاید ہی کسی میں ملے۔

محترم عنایت صاحب سرمایہ پر محنت کی بالادستی کے قائل تھے۔ جہاں سرمایہ نے محنت پر حاوی ہونے کی کوشش تو کیا خواہش بھی کی وہاں سے ہمارے عنایت صاحب دامن جھاڑ کر اُٹھ بیٹھتے تھے۔ پاکستان میں "کوہستان" سے علیحدگی کا سبب بھی یہی تھا اور یہاں لندن میں مشرق سے دلی تعلق منقطع کر لینے کی وجہ بھی یہی تھی۔

۱۹۶۹ء میں عنایت صاحب ایک بار پھر برطانیہ تشریف لاتے تو ایک نئی اشاعتی ٹیم، ایک نئے اشاعتی ادارے اور ایک نئے اخبار کی داغ بیل ڈال کر گئے۔ اب کہ عنایت صاحب کی ذہنی تخلیق کا نام "اخبار وطن" تھا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی عنایت صاحب نے ہمارے لئے سب کچھ کر دیا لیکن اپنے لئے ایک پونڈ کا احسان اٹھانا بھی گوارا نہ کیا۔ میں تو اسے عنایت صاحب کی کرامت کہوں گا کہ سرمایہ کو محنت پر ترجیح دینے والوں کے اخبار کوہستان اور مشرق لندن کے نام تک مٹ گئے ہیں لیکن محنت کی عظمت میں یقین رکھنے والوں کی تخلیقات مشرقِ پاکستان اور اخبارِ وطن لندن دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔

مغرب میں رہنے والے پاکستانیوں پر محترم عنایت صاحب کا یہی احسان نہیں کہ انہوں نے انہیں ان کی اپنی زبان میں پہلے مشرق اور پھر اخبارِ وطن دیئے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ محترم عنایت صاحب نے انہیں دیارِ غیر میں زندہ رہنے کا عزم اور مِل بیٹھنے کے مواقع فراہم کئے۔ اخبارِ وطن کے ذریعے سارے یورپ اور امریکہ میں پھیلے ہُوئے پاکستانی ایک مرکز پر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ انہیں ایک ایسا فورم مل گیا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مسائل باہمی طور پر حل کرنے لگے ہیں۔ عنایت صاحب کی توجہ سے یورپ میں کاروبار کرنے والے پاکستانیوں کے لئے بھی نئے اور وسیع مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلے چند لوگوں کے سوا کوئی نہ جانتا تھا کہ کوئی تاجر کیا بیچتا ہے لیکن اب اخبار وطن کے ذریعے ان کے گاہکوں کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا ہے۔

ریاض بٹالوی

اکیلا آدمی

عنایت صاحب کی وفات پر ان کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ——
دوستوں نے کہا "وہ بہت پیارے دوست تھے" ساتھیوں نے کہا "ان جیسا رفیق کہاں ملے گا" صحافیوں نے کہا "وہ جدید صحافت کے بانی تھے" اور ملنے والوں نے کہا "وہ ایک بااصُول اور وضع دار شخص تھے" کسی نے انہیں بہترین منتظم قرار دیا۔ کسی کے نزدیک نامور صحافی تھے۔ کسی کی نظر میں وطن دوست اور کسی کی نگاہ میں انسان دوست تھے"

میں نے عنایت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے۔ بلاشبہ وہ سب کچھ تھے۔ اخبار ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انہوں نے اپنا وقت، اپنی توانائی اور اپنی صلاحیتیں اخبار کے لئے ہی وقف کر رکھی تھیں۔ مگر اخبار کے ریپر سے ہٹ کر ان کی ایک الگ شخصیت بھی تھی اور اپنی اس زندگی میں وہ بالکل ایک عام انسان تھے۔ ان کی یہ زندگی گھر کی چار دیواری اور چند معتمد دوستوں اور ساتھیوں کے درمیان محدود تھی۔ اور وہ اس دُنیا میں ایک ایسے آدمی کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے جو لوگوں کی نگاہوں سے ہٹ کر اپنی خامیوں کا تجزیہ کرتا ہے وہ قہقہے لگاتا ہے افسردہ ہوتا ہے۔ موسیقی سنتا ہے، لطیفے کہتا ہے اور اپنی ذات کے مخصوص خول سے باہر نکل آتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے اور کسی کی قربت

کی دعائیں کرتا ہے کبھی وہ بڑے سے بڑے صدمے کو ہنس کر ٹال جاتا ہے اور کبھی چھوٹی سے چھوٹی بات کو زندگی کا روگ بنالیتا ہے۔

عنایت صاحب نے اپنی ۸۴ سالہ زندگی میں کسی شخص کو اپنی ذات کے اس آئینے میں جھانکنے کی اجازت نہیں دی اور لوگوں کے سامنے اخبارات کے صفحات اور تعزیتی مضامین میں لپٹی ہوئی ان کی صحافیانہ شخصیت ہی رونق افروز رہی ہے۔ میں انہیں آپ سے ایک عام آدمی کی حیثیت سے متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں نے ان کی ذات کے ان مخفی پہلوؤں کو بار بار دیکھا ہے۔

عنایت صاحب کو ہمیشہ سے سحر خیزی کی عادت تھی۔ وہ نور کے تڑکے اُٹھتے تازہ پانی سے وضو کرتے اور زندگی کے معمولات شروع کرنے سے پہلے خُدا کے حضور سربسجود ہوجاتے۔ میں نے اکثر انہیں نماز کے دوران زاروقطار روتے ہوتے دیکھا ہے۔ نماز سے فارغ ہوکر اخبار مارکیٹ جاتے اور وہاں کچھ دیر رُک کر سیر کے لئے نکل جاتے۔ عام طور پر باغِ جناح میں جایا کرتے تھے لیکن جب انہوں نے گلبرگ میں گھر لے لیا تو نہر کے کنارے گھومنے لگے۔ سیر سے واپس آتے تو اپنے بیڈ روم کے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور تمام اخبارات کا مطالعہ کرتے۔ وہ بیڈ ٹی کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ صبح کی اس چائے میں بڑھیا سے بڑھیا پتی استعمال کرتے اور اس کے لئے چائے کے عمدہ اور اعلیٰ برانڈ ڈھونڈ کر لاتے۔

اخبارات کا مطالعہ کرنے کے بعد شیو کرتے، نہاتے اور ناشتے سے فارغ ہوکر پورے نو بجے دفتر آجاتے۔ عام طور پر سب سے پہلے دفتر پہنچتے تھے۔ وقت کے بہت پابند تھے اور پابندیٔ اوقات پر سختی سے عمل کراتے تھے۔ گاڑی میں ہمیشہ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے کار میں اکیلے ہوں تو بھی اگلی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ "پچھلی سیٹ پر

بیٹھا ہوا آدمی یوں محسوس کرتا ہے جیسے اسے کوئی کھینچ کرلے جا رہا ہو۔"

مرحوم فطرت کے حسن سے بہت محظوظ ہوتے تھے انہیں پھولوں اور درختوں سے پیار تھا۔ ہمیشہ ایسی جگہ رہنا پسند کرتے تھے جہاں بہت سے سایہ دار درخت ہوں اور گھر سے دفتر تک کا راستہ بھی صاف ستھرا اور سایہ دار ہو۔ شادمان کالونی آباد ہوئی تو ان کے ساتھیوں نے متعدد بار کہا کہ یہاں گھر لینا چاہیئے" مگر انہوں نے اس لئے وہاں رہنا پسند نہ کیا کہ اس جگہ درخت نہیں تھے انہیں گلاب کی رنگت، موتیا کے پھول اور رات کی رانی کی خوشبو پسند تھی۔ جو بھی نیا گھر لیتے وہاں رات کی رانی کا پودا ضرور لگواتے۔ یہ پودا اپنے کمرے کے قریب لگواتے تاکہ جب پھول آئیں تو رات بھر ان کا کمرہ مہکتا رہے۔

عنایت صاحب خوش اطوار، خوش لباس اور خوش خوراک آدمی تھے۔ کھانے کے معاملہ میں ان کی پسند بہت متنوع تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان دفتر میں ہی کھاتے تھے۔ گھروں سے سب لوگوں کا کھانا آجاتا اور سب مل کر ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ جاتے۔ اس کھانے کو وہ کمیونٹی لنچ کہتے تھے۔ یہ سلسلہ عنایت صاحب کے شادی کر لینے کے بعد بھی جاری رہا۔ دوپہر کا کھانا دفتر میں کھانا ان کا معمول تھا اور اس کے بعد وہ آرام کے لئے گھر جایا کرتے تھے۔

کمیونٹی لنچ اس خواہش کا محرک تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کو ایک خاندان تصور کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے درمیان دفتری کام سے ہٹ کر بھی معمولات زندگی کی سانجھ رہے۔ دوسرے یہ کہ دسترخوان پر سجے ہوئے مختلف سالن اور طرح طرح کی نعمتیں کھانے کے معاملے میں ان کے شوق اور مزاج کے تنوع کو تسکین دیتی تھیں۔ کھانے کے دوران جہاں بہت سے دفتری اور ذاتی مسائل زیرِ بحث آتے وہاں ان کے دلچسپ فقرے دن بھر کی تھکن دور کر دیتے۔ ایک روز گوشت کا ناغہ تھا، سب کے گھروں سے سبزی

پک کر آتی۔ مرحوم اپنے مخصوص انداز میں بولے "کیا بچت کی مہم شروع کر رکھی ہے"؟ ان کے بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور ہلکی پھلکی فقرے بازیوں پر سب کے چہرے کھل اُٹھتے تھے، کبھی ان کی پسند کی کوئی چیز پک کر نہ آتی تو کہتے "آج فاقہ ہے"۔

عنایت صاحب ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں چینی اور چاول کھانے سے منع کر رکھا تھا مگر وہ سویٹ ڈش ضرور کھاتے اور چاولوں سے پرہیز بھی نہ کرتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی صحت سے غافل تھے یا پرہیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے البتہ کھانے پینے کے معاملہ میں ان کا نقطہ نظر ذرا مختلف تھا وہ کہا کرتے تھے کہ "انسان کی زندگی بڑی مختصر ہے۔ اس پر بھی پابندیاں عائد کر لی جائیں تو جینا دوبھر ہو جائیگا" اسی لئے ان کی آزاد طبیعت کو پابندیاں کبھی راس نہ آئیں، وہ آزاد ماحول میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ حکم بجا لانے کے آداب وضوابط سے بے نیاز تھے۔ ان کا کُل سرمایہ ایک بریف کیس تھا۔ کہا کرتے تھے کہ "میری کونسی جائداد ہے۔ بریف کیس اٹھاؤں گا، یہاں نہیں تو وہاں سہی"۔

وہ نجی اور مخصوص دعوتوں میں بڑے اہتمام سے جایا کرتے تھے۔ کوئی دوست ان کی دعوت کرتا تو اپنے ساتھیوں کو تلاش کرتے پھرتے۔ چند ساتھیوں کو جمع کرتے اور انہیں بتاتے کہ "فلاں صاحب کے ہاں دعوت پر جانا ہے۔ اور گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے میزبان سے مخاطب ہوتے اور کہتے "حاضرین ساتھ لایا ہوں" ان کے دوست بھی جانتے تھے کہ عنایت صاحب اپنے ساتھیوں کے بغیر کہیں نہیں جاتے۔ حتیٰ کہ ان کے ذاتی معاملات میں بھی یہی لوگ دخیل ہیں۔ چنانچہ عنایت صاحب کو کھانے یا چائے پر بلاتے ہوئے ان کے ساتھیوں کو خاص طور پر دعوت دی جاتی تھی۔

دعوتوں کے ضمن میں عنایت صاحب کے گھر پر اتوار کے روز ہونے والی دعوت

کا ذکر کئے بغیر بات نہیں بنتی، ہر اتوار کو ان کے ہاں خاص دعوت کا اہتمام ہوتا تھا جسے وہ "سنڈے ایڈیشن" کا نام دیا کرتے تھے۔ اس دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ یا تو سب ساتھیوں کے گھروں سے کھانا آجاتا تھا یا باری باری ہر شخص کھانے کا اہتمام کرتا تھا۔ فرش پر چادر بچھا کر کھانا چن دیا جاتا۔ عنایت صاحب بنیان اور پاجامہ پہن کر بیچ میں بیٹھ جاتے اور سب لوگ بے تکلفی سے کھاتے۔ فقرے بازیاں ہوتیں، لطیفے ہوتے اور عنایت صاحب خوب ہنستے اور ہنساتے۔ بعض اوقات یہ دعوت گھر سے باہر کسی پارک یا پکنک سپاٹ پر منعقد کی جاتی تھی۔ یہ دوستوں کی خاص محفل ہوتی تھی۔ جس میں دفتر کے ایک ادنیٰ کارکن سے لے کر اعلیٰ افسر تک سبھی شامل ہوتے اور ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ اپنی چھٹی اور آرام کا دن وہ اس تقریب کی نذر اس لئے کر دیتے تھے کہ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب سے ہٹ کر اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی صورت میں ایک خاندان بنا یا تھا اور انہیں اس خاندان کے افراد سے چند گھنٹوں کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی اور پھر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہفتے بھر کی تھکن، کام کا بوجھ اور زندگی کے گوناگوں مسائل کی بوریت دور ہو جائے۔

وہ دوپہر کو چند گھنٹے آرام ضرور کرتے تھے۔ دفتر سے گھر آتے نہاتے اور کپڑے بدلتے۔ ان کا کہنا تھا کہ کرتا پاجامہ ہلکا لباس ہے اس میں آرام بہت ملتا ہے۔ دراصل ان کے پیشہ ورانہ فرائض اتنے بوجھل اور سخت تھے کہ وہ گھر میں آکر اس گھمبیرتا اور بوجھل پن سے ذہنی طور پر نجات حاصل کرتے تھے۔ انہیں دفتری اوقات کے دوران لوگوں سے ملنا ہوتا تھا، میٹنگوں کے لئے باہر جانا ہوتا تھا اور کئی کئی گھنٹوں تک ٹائی اور سوٹ میں جکڑے رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ دفتری آداب اور ڈیکورم کا خاص خیال رکھتے تھے۔ گھر میں آرام کے لئے لیٹنے سے پہلے ریڈیوگرام پر ریکارڈ چڑھا دیتے یا

ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کر دیتے اور آنکھیں بند کر کے اپنی پسند کے گیت سُنتے۔

موسیقی کے بارے میں عنایت صاحب کا ذوق بہت عمدہ تھا۔ انہیں سہگل کانن بالا، خورشید، مناڈے، سی ایچ آتما اور نور جہاں کی آوازیں بہت پسند تھیں اور ان گلوکاروں کے بے شمار ریکارڈز اور گیتوں سے بھرے ہوتے ٹیپ ان کے پاس موجود تھے۔ ہلکی پھلکی موسیقی کے ساتھ کبھی کبھی کلاسیکل موسیقی سے بھی دل بہلاتے تھے۔ استاد امانت علی خان، فتح علی خان کے پکے راگ اور بسم اللہ خان کی شہنائی انہیں پسند تھی۔ شہنائی کا ٹیپ ان کے ایک دوست نے کراچی سے بھجوایا تھا جسے لینے کے لئے وہ خود ایئرپورٹ پر گئے تھے۔ لندن سے واپس آتے تو مغربی موسیقی کے ریکارڈ بھی لے کر آتے جنہیں وہ اتوار کے روز سُنا کرتے تھے۔

عنایت صاحب کے روزمرّہ کے معمولات بڑے سپاٹ اور خشک تھے۔ دن بھر ادارتی ذمّہ داریوں اور انتظامی فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے اور اپنی اس حیثیت میں بڑے سنجیدہ اور متین انسان تھے مگر ان کے اندر کا انسان بہت لطیف، بہت خوش مزاج اور بہت ہی نرم و نازک تھا۔ وہ اچھی پینٹنگ کی تعریف کرتے تھے۔ اچھے شعر پر داد دیتے تھے اور خوبصورت فقروں کو سراہتے تھے۔

مرحوم کی خوش لباسی بھی ان کے خوش ذوق ہونے کی علامت تھی۔ لباس کے معاملہ میں ان کی پسند بہت اُونچی تھی۔ بڑی نفاست اور قرینے سے کپڑے پہنتے تھے ٹائی اور قمیص سوٹ کے ساتھ "میچ" ہونی چاہیئے "کمبی نیشن" میں رنگوں کا امتزاج کیسا ہونا چاہیئے۔ موزے پتلون کے رنگ کے ہوں تو اچھے لگتے ہیں۔ جوتوں کی شکل کیا ہو۔ کس موسم میں کونسا رنگ بھلا لگتا ہے اور مردوں کے لئے کس رنگ کا لباس موزوں ہے۔ لندن جاتے تو بڑے بڑے سٹوروں سے چُن چُن کر چیزیں خریدتے۔ انہیں علم تھا کہ لندن کے

کس سٹور سے کون سی چیز اچھی ملتی ہے مگر اچھا لباس پہننے کا شوق صرف ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں تھا۔ اپنے ساتھیوں کو بھی اچھے اور صاف ستھرے لباس میں دیکھنا چاہتے تھے اور خوش پوش کارکنوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ لندن کے بڑے بڑے سٹوروں سے اپنے لئے چیزیں لیتے ہوتے اپنے ساتھیوں کو بھی یاد رکھتے تھے۔ اور ان کی پسند اور ذوق کے مطابق تحفے خریدتے تھے۔ جب بھی لندن جاتے اپنی قمیض ٹائیاں اور دوسرا ساز و سامان ساتھیوں میں بانٹ جاتے واپس آتے تو ان کے لئے نئی قمیضیں، ٹائیاں اور سویٹر لے کر آتے۔

ان کا لباس پہننے کا انداز اور رنگوں کا انتخاب بھی بدلتا رہتا تھا۔ دراصل انہیں سپاٹ اور یک رنگ زندگی پسند نہیں تھی، وہ کہتے تھے کہ زندگی کی یکسانیت، رُوح کو بے کیف اور صلاحیتوں کو زنگ آلود بنا دیتی ہے۔ وہ تبدیلی اور ترقی کے قائل تھے اور بہتر سے بہتر کی تلاش کے جذبے کے تحت تبدیلی چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں وہ اخبار کی دیدہ زیبی اور معیار کی بلندی کے لئے لے آؤٹ کا انداز بدلواتے رہتے تھے اسی طرح لباس کی یکسانیت اور ایک سا انداز بھی انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے لباس کا خاص طور پر جائزہ لیتے۔ کسی کا لباس غیر موزوں لگتا تو ٹوک دیتے اور اپنا مخصوص جملہ دہراتے "یہ فاؤل ہے"۔

صفائی پسند تھے اور انہیں اُجلے لباس پر معمولی سا دھبّہ بھی پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ صاف ستھرا لباس نظر ہی کو نہیں دل و دماغ کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ان کا قول تھا کہ زندگی کے معاملات میں خوش لباس انسان کا رویّہ صحت مندانہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے گھر اور اپنی ذات ہی کو نہیں ہر شخص کو اُجلا اور نکھرا نکھرا دیکھنا چاہتے تھے گنگا رام ہسپتال میں داخل تھے کہ ایک نرس انہیں دوا پلانے آئی۔ نرس کی وردی پر جگہ جگہ

دوا کے دھبے لگے تھے۔ عنایت صاحب نے ناگواری سے اسے دیکھا اور جب چلی گئی تو کہنے لگے "صورت اچھی نہ سہی، لباس تو بے داغ ہونا چاہیئے" ہسپتال کے عملے کی صاف ستھری وردیوں اور اچھے سلوک سے مریض کی آدھی بیماری دُور ہو جاتی ہے۔"

مستقبل پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ عنایت صاحب ماضی سے اپنا رشتہ توڑنے کو تیار نہ تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے یورپ کے بہترین ٹیلروں سے اپنے سُوٹ سلوائے، بڑے بڑے معیاری سٹوروں سے قمیضیں خریدیں مگر ان کی کتر بیونت اور رفُونگ کے لئے نسبت روڈ کے ایک عام درزی کو بلاتے تھے ہم کہتے "عنایت صاحب! یہ شخص پتلون کا ستیاناس کر دے گا تو جواب دیتے "یہ میرا پرانا درزی ہے اسے بھُول تو نہیں جانا چاہیئے" اسی طرح انہوں نے اپنے علاج کے لئے دنیا کے بہترین ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں، لاہور اور لندن کے مہنگے ہسپتالوں میں داخل رہے مگر انجکشن لگوانے کے لئے اپنے ایک پُرانے جاننے والے کمپاؤنڈر کی دکان پر چل کر جاتے تھے۔ ہم اس بات پر حیران ہوتے تو جواب دیتے کہ عسرت کے زمانے میں وہ اسی سے علاج کراتے رہے ہیں اُسے کیسے بھُول جائیں۔

زندگی کو متنوع بنانے کے لئے جہاں وہ ہر چیز میں تبدیلی کے قائل تھے، وہاں مکان بھی بہت بدلتے تھے۔ بعض اوقات تو سال میں چار چار بار گھر بدلتے۔ ایک مکان پسند آتا تو کرائے پر لے کر رہنے لگتے مگر کچھ عرصے بعد انہیں احساس ہوتا کہ گھر کے آس پاس شور بہت ہوتا ہے۔ دوسرا مکان لیتے وہاں اگر شور شرابے کی شکایت نہ ہوتی تو جگہ کی تنگی سے پریشان ہو جاتے۔ یہ گھر چھوڑ کر اور کوئی گھر لیتے تو اس میں چند ماہ رہنے کے بعد اس کی دُوری کا گلہ کرنے لگتے۔ وہ کاروباری معمولات سے الگ ہو کر خاموشی اور سکون کے قائل تھے اور جب سکون میسّر نہ آتا تو کسی نہ کسی بہانے مکان بدل لیتے۔

وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے اُن کے مزاج ، رتبے اور شخصیت کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس سے کس لہجہ میں بات کرنی ہے۔ وہ اگر اپنے کسی ساتھی کو معمولی غلطی پر سختی سے ڈانٹتے تو دوسرے ساتھی کی بڑی سے بڑی غلطی کی نشاندہی نہایت نرم لہجہ میں کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک کے لیے آنکھ کا اشارہ کافی ہے۔ اور کسی کے لیے چھڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنے جن ساتھیوں کا احترام کرتے تھے اُن سے گفتگو بھی بہت نپے تلے الفاظ میں کرتے۔ مذاق کرتے مگر نہایت ہی پروقار طریقہ سے، فقرے بازی ہوتی مگر بہت خوبصورت لہجہ میں۔ انہیں اپنے دوستوں کی عادات کا بھی علم تھا' ان کے ایک گہرے دوست ہیں' ان سے کوئی کام لینا ہوتا تو کہتے انہیں ایک ہفتہ پہلے بتا دو گھر سے آج روانہ ہوتے تو سات روز بعد ہم تک پہنچیں گے۔ ایک اور ساتھی کا ذکر ہوتا تو فوراً بولتے "سو رہے ہوں گے" ایک کارکن کی تلاش ہوتی تو فقرہ چُست کرتے "کسی ہوٹل میں جھانکو" میں اگر کسی کام سے باہر جاتا اور انہیں میری ضرورت پڑتی تو کہتے "کسی ہسپتال میں فون کرو"۔

وہ گپ شپ کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور پاک چین دوستی والے ممتاز احمد خان کے ہاں اکثر جاتے تھے۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے گھر کے پکوڑے اور خان صاحب کی وائٹ جاسمین چائے بہت پسند تھی۔ ڈاکٹر خورشید کے ہاں جاتے تو کہتے "حاضرین پکوڑے کھانے آتے ہیں" ممتاز احمد خان سے ملتے تو گویا ہوتے "ممتاز صاحب چائے کی سپلائی لائن معطل ہو گئی ہے۔ چین سے تعلقات خراب ہو جائیں گے"۔

عنایت صاحب کی گفتگو میں مزاج کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے بولتے مگر شگفتگی سے بھرپور ہوتے۔ ان کی بیگم بچوں کو لے کر میکے گئی ہوتی تھیں' ایک روز بڑی بہن نے مشورہ دیتے ہوئے کہا "تم کہو تو جکوال جا کر تمہاری بیوی کو لے آؤں۔ اب تو بچہ

دوڑنا ہوگا۔ عنایت صاحب نے بہن کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بولے" تب تو اسے اولمپک کے مقابلوں میں بھجوا دینا چاہیئے"۔

عنایت صاحب کی شادی بھی بڑے انوکھے انداز میں ہوئی۔ اس مختصر اور سادہ سی تقریب میں جسے اخباری زبان میں باوقار کہا جاسکتا ہے۔ عنایت صاحب کے قریبی دوست مولانا کوثر نیازی کے علاوہ دفتر کے چند افراد شامل تھے۔ زبیری صاحب ان کے وکیل تھے اور لطیف صاحب اور چودھری حمید صاحب گواہ۔ نکاح مولانا نے پڑھایا اور یوں وہ بیوی والے ہو گئے۔ جس روز عنایت صاحب کی شادی تھی خوب بارش ہوئی۔ بارش تھمنے کے بعد برات اس طرح پیدل روانہ ہوئی کہ آگے آگے عنایت صاحب تھے اور پیچھے باقی لوگ دلہن کے گھر کا فاصلہ کوئی ایک میل ہوگا۔ ابھی تھوڑی دُور گئے تھے کہ عنایت صاحب کا پاؤں ایک گڑھے میں پڑا کہنے لگے" آج واپس چلتے ہیں کل آجائیں گے"۔

عنایت صاحب کی بعض عادتیں اکثر ان کے ساتھیوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتی تھیں۔ ان کی ایک عادت تو یہ تھی کہ وہ بیماری اور تکلیف میں بھی اپنی جسمانی اور ذہنی کیفیت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی مزاج پُرسی کرتا تو کچھ بتانے سے گریز کرتے میں نے انہیں سخت تکلیف اور جان لیوا درد میں بھی ہائے ہائے کرتے یا سر پیٹتے نہیں دیکھا۔ بعض اوقات ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوتا۔ گردے یا گردن میں تکلیف ہوتی تو دفتر آجاتے اور خاموشی سے بیٹھے رہتے۔ تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی تو اپنی چھڑی اٹھاتے اور یہ کہہ کر گھر چلے جاتے کہ" آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں" ابتدا میں تو وہ حال پُوچھنے پر ٹال جاتے تھے اور دوسروں کے سامنے خود کو تندرست ظاہر کرتے تھے۔ ایک بار تمام رات درد میں تڑپتے رہے اور کراہتے رہے۔ صبح ہوئی تو میں نے پوچھا کہ عنایت صاحب آپ

کی طبیعت کیسی ہے؟ انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولے "ٹھیک ہوں" ایسے موقعہ پر میں ان کے صبر، حوصلہ اور ہمت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

شاید عنایت صاحب یہ سمجھتے ہوں کہ اپنے جن ساتھیوں کے لئے انہوں نے دُکھ جھیل کر سکھ تلاش کئے ہیں انہیں اپنے روگ بتا کر دُکھی نہ کریں کہ یہ احسانات کا بدلہ ہوگا۔

عنایت صاحب نے اپنی دُنیا خود بنائی تھی۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ سینی ٹوریم اور ہسپتالوں میں گزارنے کے باوجود زندہ رہنے کے لئے سہارے نہیں ڈھونڈے تھے۔ اب کیوں کسی کا ہاتھ تھامیں گے۔ زندگی کے آخری ایام میں ایک ڈاکٹر کی غلط تشخیص کی وجہ سے ان کی ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ آگئی اور چلتے ہوئے ان کے قدم ڈگمگاتے تھے۔ ایک روز ہوٹل میں چائے پینے کے لئے گئے۔ ہوٹل کی سیڑھی چڑھنے لگے تو میں نے چاہا کہ ان کا بازو تھام لوں لیکن اس سے پہلے ہی وہ دیوار کے سہارے سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہیں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر کسی کا بازو تھام کر بلندی پر پہنچنا ان کی خودداری اور عزم و ہمت کی توہین تھی۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے چلنے پھرنے کے لئے ایک چھڑی لے لی۔ البتہ زندگی کے آخری ایام میں عنایت صاحب اتنے نڈھال اور کمزور ہوگئے تھے کہ ان کی یہ نقاہت ان کے مزاج پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ اگرچہ وہ اس حالت میں بھی اپنی ہمت اور حوصلے کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے تھے مگر جب قویٰ ہی جواب دے جائیں تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ موت سے ایک روز قبل انہیں کار میں بٹھا کر البرٹ وکٹر ہسپتال لے جایا گیا تو انہوں نے کمرے تک خود چل کر جانے کی ناکام کوشش کی۔ جب سنبھل نہ سکے تو یہ کہہ کر ایک ساتھی کا سہارا لے لیا کہ "اب ہمت نہیں رہی"۔

یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تھے۔ وہ بسترِ مرگ پر پڑے تھے۔ سانس اُکھڑ چکی

تھی۔ قوتِ گویائی جواب دے گئی تھی۔ اور ان کی ہمتیں اور ان کے حوصلے ختم ہو گئے تھے۔ میں نے تولیہ اٹھا کر ان کے چہرے پر آتے ہوئے پسینے کو صاف کرنا چاہا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے خاموش زبان میں کہہ رہے ہوں کہ میری بیماری اور بے بسی کا فائدہ اٹھا کر سہارا دینے کی کوشش نہ کرو، میں سہارے تلاش کرنے کا عادی نہیں رہا یہ میری خودداری کی توہین ہے۔ اور واقعی انہوں نے اپنی خودداری کے اس بھرم کو قائم رکھا اور رالبرٹ وکٹر ہسپتال کے ایک کمرے میں سب سے چھپ کر کسی کو آواز دیئے بغیر اور کسی پر اپنی جان کنی کے کرب کا اظہار کئے بنا چپکے سے جان دے دی۔

موت کے وقت ان کے چہرے پر ایک اچھوتی مسکراہٹ جھلک رہی تھی اور یہ مسکراہٹ اس فتح مندی اور احساس خودی کی علامت تھی کہ انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک سہارا قبول نہ کیا تھا۔

بیگم عنایت اللہ

ایسی قربت، ایسی دوری

"اور دی دنیا میں ہم نے اس کو خوبی
اور وہ آخرت کے اچھے لوگوں میں ہے"

سورۃ النحل کی یہ آیت جب بھی تلاوت کرتی ہوں تو میرا دھیان فوراً عنایت صاحب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو زندگی بھر ناقابل شکست کامیابیاں بے پناہ مقبولیت، دلسوزی اور ایثار کی حد تک اپنے رفقار کی محبتیں لوٹتے رہے اور جبکہ وہ جولائی کی آخر شب آخرت کے اچھے لوگوں میں جا ملے ہیں تو یہ محبت دلوں سے بلند ہو کر لبوں تک آگئی ہے ان کی خوبیوں کا چرچا زبانوں پر موجود ہے ان کے کردار کا اجلاپن سب پر عیاں ہو گیا ہے یوں لگتا ہے لوگوں کے پاس اظہار بیان نہیں ہے جس سے وہ اپنے بے پایاں جذبات کا اظہار کر سکیں، ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو عنایت صاحب کے چلے جانے بعد ان پر نچھاور کر سکیں۔

اس وقت لوح و قلم ہاتھ میں لئے میں بھی اسی تہی دامنی کے تذبذب میں مبتلا ہوں۔ ان کی شریک زندگی ہونے کے ناطے، میں ان کے زیادہ قریب تھی۔ ان کی علالت کے شب و روز میری رفاقت میں گزرے لیکن ان سب کے باوجود یوں

لگتا ہے۔ جیسے سب ہی ان کے قریب تھے، ان کے احباب و رفقاء عزیز رشتہ دار ہم رتبہ لوگ، دفتر کے چپڑاسی، غریب غربا اور بوڑھے یہ وہ لوگ ہیں جو ان کو ذاتی طور پر جانتے ہیں اگر میں اس دائرہ رفاقت کو ذرا معنوی رنگ میں لوں تو ہر وہ شخص جو اخبار پڑھتا ہے ان سے واقف ہے ان سے باتیں کی ہیں ان سے سرگوشیوں میں مشورے لئے ہیں، مزاحیہ کالموں کے زیرِلب تبسم یا پھر ان کے افکار میں شریک رہا ہے کسی نے ان سے سیاسی بصیرت پائی اور کسی نے زندگی کے حسن کا راز سیکھا ان کے کردار کے اسی عمرانی پہلو نے سب کو ان کا اور ان کو سب کا بنا دیا

اسے عنایت صاحب کے کردار کی خوبی کہوں یا ان کی شخصیت کا سحر کہ ہر کوئی مسحور ہو جاتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ لوگ ان سے ایثار اور قربانی کی حد تک پیار کرنے کے باوجود اپنے طور پر یہی سمجھتے تھے کہ ہم نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا خوب سے خوب تر کی تلاش میں لوگ چپکے چپکے ان کی خوشنودی میں لگے رہتے۔ بعد مرنے کے لوگوں نے ان کی خدمات کا جس جس طرح اعتراف کیا یا عقیدت کے اظہار کا جو بھی انداز اختیار کیا اس میں ایک چیز جو نمایاں اور لاریب ہے وہ ان کی ذات سے بے لوث محبت و شیفتگی ہے، والہانہ وابستگی ہے جس کا مظاہرہ مختلف انداز میں ہوا۔

عنایت صاحب فطرتاً کم گو تھے لیکن ان کی خاموشی میں قدرت نے بھرپور تکلم کا انداز دے دیا تھا، ان کی موجودگی لوگوں کے لئے دلی وابستگی کا ذریعہ بن جاتی۔ کوئی مسئلہ، کوئی دشواری یا کوئی فیصلہ، چٹکیوں میں اس کا ذہنی تجزیہ کر کے بغیر اس کے نتائج و عواقب ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے، وہ اعلان یا تشہیر کو بغیر عمل کے ناپسند کرتے تھے، ان کا ذہن ایک طرح سے کمپیوٹر تھا جس پر تمام مسائل ایک فلیش کی طرح پڑتے اور دوسرے لمحے نہایت صائب رائے باہر آجاتی، ان کے ذہن کی اس حیرتناک

صلاحیت، ان کی عملی جدو جہد کی کارکردگی اور کردار کی جانثاری و ایثار پسندی نے انہیں انتہائی کامیاب، پرجوش اور مقبول بنا دیا تھا لوگ ان سے اس طرح محبت کرتے کہ حیرت ہوتی، ساتھیوں کا بس نہ چلتا کہ کس طرح ان پر جاں نثار کردیں جب وہ اپنے ابدی گھر روانہ ہوئے تو ان کے احباب دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، ہر ایک کا دل ان کا مدفن تھا وہ شفیق ہستی جو سب کی غمگسار تھی آج سب اس کی جدائی میں غمگین تھے جدائی بھی کیسی، دائمی جدائی، ابدی جدائی، ہمیشہ کی جدائی۔

ان کی عارضی جدائی کا بھی ہم نے تو کبھی تصور نہ کیا تھا، وہ صبح کو دفتر کے لئے جدا ہوتے تو ہم سب بچے اور نوکروں سمیت ان کی آمد کا انتظار کرنے لگتے، وہ سو جاتے تو ہم ان کے جاگنے کا انتظار کرتے وہ دورے پر باہر جاتے تو ہم اسی روز ان کی واپسی کے دن گننے لگتے، وہ گھر میں داخل ہوتے تو لگتا دنیا جہاں کی رونقیں سمٹ آئی ہیں، ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی تمام زندگی میں سب کے لئے موجود رہا دفتر میں ان کی آمد کی اطلاع سے ایک ہل چل مچ جاتی لوگ جلدی جلدی کاموں میں لگ جاتے، کام کے بارے میں ان کی باریک بینی کی وجہ سے دلوں پر رعب ساطاری ہو جاتا لیکن پھر بھی یوں لگتا کہ ان کی موجودگی سب مسائل حل کر دے گی ان کے ہوتے ہوئے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور لوگ پوری طمانیت قلب سے کام میں جت جاتے کوئی افسر اپنے ماتحتوں میں مقبول تو ہو سکتا ہے لیکن محبوب اسی طرح ہوتا ہے کہ عنایت صاحب کی طرح اپنے نوکروں اور چپڑاسیوں تک کو اپنے بچوں کی طرح عزیز جانے۔

عنایت صاحب کے فن کو ان کے کردار سے جدا کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا فن یا کردار اور کارکردگی ان تینوں کے مجموعے کا ایک تاثر ان کی شخصیت کا ایک امیج

بناتا ہے، وہ ایچ جو بھرپور ہو اور جس میں کوئی جھول نہ رہے اخباری زندگی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی وہ سچ مچ کام کرتے کرتے اخباروں پر سو جاتے اور جب جاگتے تو وہیں اخباروں کے ڈھیر میں بیٹھ کر کام کرنے لگتے کام کرنے کے لئے انہوں نے محنت ہی نہیں کی بلکہ وہ فن میں پوری طرح ورک رکھتے تھے۔ وہ کاتب نہیں تھے مگر کتابت کے فن کو سمجھنے کے لئے انہوں نے کتابت کے مشہور استادوں سے اس کے رموز سمجھے، وہ آرٹ ایڈیٹر نہیں تھے لیکن پرچے کے گٹ اپ میں فوراً غلطی نکال دیا کرتے وہ فوٹوگرافر نہیں تھے لیکن اخباری ضرورت کی فوٹوگرافی کی تکنیک فوٹوگرافروں کو سمجھا دیا کرتے تھے وہ ایڈیٹر نہیں تھے مگر ہر نازک مرحلے پر ان کی رائے کام کرتی، ان کا ذہن کاروباری نہیں تھا لیکن صبح کو اخبار کی تقسیم کے وقت اخبار کی مارکیٹ کی نگرانی کے لئے وہ منہ اندھیرے ہاکروں اور ایجنٹوں میں موجود ہوتے، فن، سیاست اور کاروبار پر انہیں مکمل عبور تھا۔ قدرت نے انہیں عالی دماغ بنایا تھا اور پھر عملی محنت کے زیور سے مزیّن کر دیا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ غلطی بھانپ جاتے اور فوراً ہی اس کی اصلاح و ازالہ میں لگ جاتے۔

اخباری صنعت کو انہوں نے کس طرح صنعت بنایا اور پھر صنعت کو کس طرح فن سے ملایا ہے اس کا تجزیہ ان کے دانشور دوستوں نے اپنے مختلف مضامین میں کر دیا ہے، "اخبار" ایک صنعت ہے اور بطور صنعت کے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، عنایت صاحب بطور ایک صنعت کار کے اس کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے اور صنعت کار کی حیثیت سے انہوں نے اس کی مارکیٹ کا ہمیشہ خیال رکھا۔ غیر ممالک میں وسیع پیمانے پر دورہ کیا اور پاکستان میں جدید صنعت کے نہایت کامیاب تجربے کئے، اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لئے نئے اندازِ فکر، نئے اسلوب اور نئے

مضامین تلاش کئے ہر طبقۂ فکر کی دلچسپی کا خیال رکھا اور اخبار عوام تک پہنچا دیا۔ بطور فن کار انہوں نے خبروں، مضامین، تصاویر اور پرچے کی مجموعی ہیئت کو بدلا، اخبار کی خاص زبان مروج ہوئی اخبار میں تصاویر کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ تصویر لگانے کا ایک خاص انداز مرتب کیا اس طرح بعض باتیں صرف ایک تصویر سے عیاں ہو جاتیں۔ بعض مرتبہ تصویر اس انداز سے لگائی جاتی کہ عام پڑھنے والا بھی اس کی خوبصورتی اور معنوں سے متاثر ہو جاتا۔ خبروں میں اہم، غیر اہم کی ترتیب، کالموں کی اہمیت، سرخیوں کو لگانے کے فن کا خصوصی خیال رکھا جاتا۔ ان کے کارکنوں کو یہ خاص تربیت دی جاتی تھی کہ وہ کسی چیز کی اہمیت کو فن کے ذریعے کیسے اجاگر کر سکتے ہیں۔

صنعت اور فن کے علاوہ اخبار ایک "سیاست" اور مشن بھی ہے اور اس کا یہی منصب سب سے مشکل اور نازک ہے لیکن عنایت صاحب نے اپنی پوری زندگی میں اس منصب کو سب سے زیادہ خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ پاکستان نے سیاست کا سب سے پر آشوب دور دیکھا ہے، لیکن عنایت صاحب کے ہر اخبار نے سیاست کو صحت مند بنیادوں پر پرکھا ہے، تخریب کی بجائے تعمیری پہلو اپنائے ہیں، اسی تعمیری پالیسی کی وجہ سے بعض مرتبہ لوگ اسے حکومت کا اخبار سمجھنے لگتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ حقائق سے اجتناب عنایت صاحب کی فطرت میں نہیں تھا غلط احکام خواہ وہ حکومت کے ہی کیوں نہ ہوں اور اس سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کبھی نہیں مانے تھے ان کے ملنے والے جانتے ہیں کہ ان سے کبھی مرضی کے خلاف یا غلط کام نہیں لیا جا سکتا تھا، ان کا ذہن اس قدر زرخیز تھا کہ سیاسی گتھی کو دور کرنے کے لئے وہ فوراً اس کا کوئی حل نکال لیتے اپنی مرضی کا کام کچھ اس طرح کر لیتے کہ حکومت اعتراض کرنے کے قابل نہ رہتی ان تجربات کو کامیاب بنانے کے

لئے انہوں نے ہمیشہ اپنے رفقارِ کار پر اعتماد کیا۔ ادارے میں تنظیم اور اتحاد جیسی نعمتوں کو مروج کیا۔ اپنی ذاتی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔

ان کے کردار کی یہی خوبی ہے جسے ان کے کامیاب امیج سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ فن اور کارکردگی کو کردار سے ہم آہنگ کرنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن اس معاملے میں قدرت ان پر نہایت مہربان تھی۔ ان کی تمام تر کامیابیوں کا راز کردار کی یہی خوبی تھی۔ اس خوبی نے ان میں محبوبیت پیدا کر دی تھی دوست ان کے جانثار تھے ماتحت ان سے محبت کرتے تھے رفقائے کار ان کے لئے بے دریغ ہر قسم کی قربانیاں کرنے کو تیار ہو جاتے۔ اخباری زندگی کے بعض نازک مرحلوں میں اخبار کے اہم عہدہ داروں سے لے کر عام چپڑاسیوں تک نے ان کا ساتھ دیا ہے۔ عنایت صاحب فرد واحد نہیں تھے، وہ ایک ادارہ تھے ایک تنظیم تھے ایک بڑے خاندان کے سربراہ تھے ان کے عزیز، اہل خانہ، دوست، رفقائے کار اور مشینوں پر کام کرنے والے مزدور اور ہنرمند، سب سوگوار ہیں وہ شفیق اور سرپرست ہستی جس نے سب کی شخصیت کو سنوارا ہے سب سے جدا ہو گئی، وہ اپنی جانشینی کے لئے بہت سے ہیرے تراش گئے ہیں، ان کا مشن مکمل ہو گیا کیونکہ وہ صرف اخبار کے لئے بنائے گئے تھے اور یہ مقصد پورا ہونے کے بعد خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اخباروں سے بے نیاز ہو گئے تھے علالت کے دوران انہوں نے اپنے ہر سانس کے ساتھ خدا کو یاد کیا ہے وہ بہت صابر اور خاموش طبع تھے، اللہ کو وہ بہت چپکے چپکے پکارتے، کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے میری کسی ایمان افروز بات پر بے ساختہ ان سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جس سے ان کے دل کے نہاں خانوں میں چھپے ہوئے ایمان کی تجلی کوند اٹھتی۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں

نہایت پختہ ایمان سے نوازا تھا۔ اس پاک ذات کی ان پر مہربانیوں کا اندازہ تو اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے انہیں موت سے پہلے استغفار کا موقع دیا تھا۔ اپنی یاد سے ان کا سینہ منور کر دیا تھا اور مرنے کے بعد ہزاروں لوگوں کی دعاؤں کو ان کی بخشش کا وسیلہ بنا دیا ہے، خدا کو وہ کس قدر پسند تھے اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ان کی بخشش کے سامان اور وسیلے اللہ نے خود پیدا کر دیئے تھے اور وہ اپنے محبوب حقیقی سے نہایت آسودہ ہو کر جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

چودھری محمد اشرف

جدّو جہد کی داستان

اس میں کوئی شک نہیں کہ عنایت اللہ مرحوم نئے جو اس ملک میں جدید صحافت کے معمار اور بانی ہیں۔ یہ منفرد مقام اپنی خداداد صلاحیت اور انتھک محنت سے حاصل کیا لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہیں مذہب پرستی، علم دوستی، شرافت، اخلاق اور حصولِ مقصد کے لئے انتھک لگن جیسی عظیم روایات اپنے خاندان سے ورثہ میں ملی تھیں۔ آپ کا خاندان شروع ہی سے علم وفضل میں منفرد مقام کا حامل ہے اور جدوجہدِ آزادی اور مسلمانوں کی ترقی میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہا ہے۔ آپ کے جدِ امجد شیخ محمد عاقل کو مغلیہ دور میں شہنشاہ شاہ عالم گیر نے ان کی علمی خدمات کے صلہ میں لاہور کے پرگنہ میں خصوصی جاگیر عطا کی تھی اور ایک معقول مشاہرہ بھی جاری کیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں شاہی احکام کی نقول آج بھی ان کے خاندان کے پاس محفوظ ہیں۔

یہ جاگیر ان کے آباؤ اجداد کی طرف سے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جدّوجہد کرنے کے جرم میں ضبط کر لی گئی اور ۱۹۰۸ء میں جب ضلع لائل پور آباد ہو رہا تھا تو عنایت اللہ مرحوم کے والد مولوی محبوب عالم موضع چیانوالی ضلع سیالکوٹ سے نقل مکانی کر کے گوجرہ کے نزدیک موضع ستراہ میں آکر آباد ہو گئے۔ آپ کے والد ایک جید عالم دین اور بلند پایہ

طبیب تھے۔ انہوں نے دینی تعلیم سب سے پہلے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے حاصل کی اور اس کے بعد مدرسہ دیوبند سے بھی علم کی پیاس بجھائی۔ مدرسہ مظاہر العلوم سے فارغ ہونے کے بعد مولوی محبوب عالم نے الحاج حافظ محدث مولانا احمد علی سہارنپوری سے علمِ طب حاصل کیا اور بعد میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں اس وقت کے مستند اور بلند پایہ اطباء کرام سے کسبِ فیض کیا۔ لکھنؤ سے واپسی پر حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب آف گولڑہ شریف کی خدمت میں حاضر ہو کر اِن کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے۔ آپ نے اپنی ذاتی محنت اور مذہب سے قلبی لگاؤ کی بناء پر حضرت پیر مہر علی شاہ کی نظروں میں جلد ہی خاص مقام حاصل کر لیا اور آپ کا شمار ان کے خاص مریدین میں کیا جانے لگا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیر و مرشد سے ان کا تعلق مزید گہرا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ آپ کی وفات کی اطلاع ملنے پر حضرت پیر مہر علی شاہ نے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو اس خبر سے آگاہ کیا اور عنایت اللہ مرحوم کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید سے ایک خط کے ذریعے ان کے والد کی وفات پر بڑے مشفقانہ پیرائے میں اظہارِ ہمدردی کیا۔

موضع ستراہ چک نمبر ۹۴۹ جھنگ برانچ کے قیام کے دوران آپ کے تعلقات گوجرہ میں سر مہدی شاہ سے قائم ہو گئے جو اس وقت گوجرہ منڈی میں آنریری مجسٹریٹ دفعہ ۳۰ تھے اور اس وقت پنجاب بھر میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ آپ کے حسنِ اخلاق اور علم دوستی سے اس قدر متاثر ہوتے کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے باقاعدہ مریدین میں شامل ہو گئے اور اس کے بعد جب تک آپ بقیدِ حیات رہے وہ تمام فیصلے آپ کے مشورہ سے کرتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کو تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ہیڈ قاضی مقرر کیا گیا اور آپ زندگی بھر اس عہدہ پر سرفراز رہے۔ آپ کے ہیڈ قاضی مقرر ہونے سے تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ کے تین سو علماء

آپ کے ماتحت تھے۔ آپ نے ان کے ذریعہ مسلمانوں میں بیداری اتحاد اور ضبط و نظم پیدا کرنے کے لئے دن رات کام کیا۔

مولوی محبوب عالم اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ مسلمان جدید علوم حاصل کئے بغیر ہندو اور انگریز کے مقابل معاشرہ میں مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے انہوں نے سر مہدی شاہ کے ساتھ مل کر بلدیہ گوجرہ سے ہائی سکول بنوایا اور مسلمان طلباء کی رہائش کے لئے ڈیڑھ ایکڑ زمین حاصل کر کے اس پر اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی اس میں ایک کچن اور طلبا کی رہائش کے لئے ایک حصہ تعمیر کروایا اور طلباء کو دینی تعلیم دینے کے لئے دیوبند سے فارغ التحصیل عالم دین کو وہاں مقرر کیا۔ ابھی یہ بورڈنگ ہاؤس زیرِ تعمیر تھا کہ ۱۹۲۳ء میں آپ اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد اس مشن کی تکمیل کے لئے سر مہدی شاہ نے لائل پور ڈسٹرکٹ بورڈ کے کلہ فنڈ سے ۲۸ ہزار روپیہ حاصل کر کے اس کے بقیہ حصہ کو تعمیر کروایا۔ ان دنوں گوجرہ منڈی کے تمام کاروبار پر ہندو مہاجن چھائے ہوتے تھے اور وہ مسلمانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے، چونکہ مولوی محبوب عالم نے علمِ طب یا علمِ دین کو کبھی ذریعہ معاش نہ بنایا تھا بلکہ کاشتکاری سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے تھے اس لئے وہ ہندو ساہوکاروں اور آڑھتیوں کے اس ظلم و ستم سے بخوبی آگاہ تھے، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو جو زیادہ تر کاشت کاری کے ذریعہ اپنی گزر بسر کرتے تھے، ہندوؤں کے استحصال سے بچانے کے لئے ۱۹۱۸ء میں گوجرہ کی سبزی منڈی خود اکیلے ٹھیکہ پر حاصل کی اور ان ہندوؤں کو وہاں سے بیدخل کر دیا اور ۱۹۲۲ء تک اس کا نظم و نسق خود چلاتے رہے۔ بالآخر ۱۹۲۲ء میں اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں کے اور ہندوؤں کی طرف سے مسلسل منت و سماجت کے بعد انہیں اس شرط پر دوبارہ منڈی میں کام کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ مسلمانوں سے سود در سود رقم وصول نہیں کریں گے لیکن اس عرصہ

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تحت ہندوستان کے عوام کو بلدیاتی اداروں میں بھی اپنے نمائندے آپ منتخب کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس پر مولوی محبوب عالم نے ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر بلدیات میں جداگانہ طریقِ انتخاب کو جاری کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ان اداروں میں نمائندگی مِل سکے۔ اس کے نتیجہ میں لاہور، لدھیانہ اور بڑی بڑی میونسپل کمیٹیوں میں جداگانہ انتخاب کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن ضلع لائل پور میں مخلوط انتخاب کا طریقہ ہی رائج رکھا گیا۔ مولوی محبوب عالم اور سر مہدی شاہ اس بات پر رضامند نہ ہوتے اور اپنی مسلسل کوشش سے گوجرہ میونسپل کمیٹی میں جداگانہ انتخاب منظور کروانے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح گوجرہ کے مسلمانوں کو پہلی بار بلدیہ کے انتخابات میں اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق مِل گیا، گوجرہ کے مسلمانوں کو جداگانہ طرزِ انتخاب آبادی کے تناسب سے میونسپل کمیٹی میں نمائندگی مِل گئی، بلکہ سر مہدی شاہ پہلی مرتبہ عوام کے ووٹوں سے دوبارہ بلدیہ کے پریذیڈنٹ منتخب ہو گئے۔ ہندوؤں کو اس بات کا سخت صدمہ پہنچا کہ گوجرہ منڈی کے بیشتر وسائل پر قابض ہونے کے باوجود میونسپل کمیٹی کا پریذیڈنٹ ایک مسلمان منتخب ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے تئیں انہوں نے اگلے انتخابات کی تیاری شروع کر دی اور گوجرہ میونسپل کمیٹی سے مسلمانوں کے تسلّط کو ختم کرنے کے لئے وزیر چند ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر رادھا کرشن کو چنیوٹ سے، اور سوہن لال کو امرتسر سے لاکر ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں حصّہ لینے کے لئے گوجرہ میں آباد کر دیا۔ دوسری طرف ۱۹۲۳ء میں مولوی محبوب عالم کی وفات سے گوجرہ میں مسلمانوں کا مرکز ختم ہو گیا اور وہ آپس میں انتشار و افتراق کا شکار ہو گئے جس کے نتیجہ میں ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں سر مہدی شاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وفات سے چند روز قبل مولوی محبوب عالم اپنے ایک ساتھی مستری مولا بخش کو ہمراہ لے کر گوجرہ کے قبرستان میں تشریف لے گئے اور ایک

جگہ کا انتخاب کرتے ہوئے ان کو اپنی وفات کے بعد اس جگہ دفن کرنے کی تلقین کی اور اس کے بعد موضع ستراہ کے مولوی سراج الدین سے جو گوجرہ کے بلند پایہ عالم اور آپ کے دیرینہ رفیق تھے، اپنی نمازِ جنازہ پڑھانے کا وعدہ لیا اور اس کے چند روز بعد ہی وہ اس عالمِ فانی سے کوچ کر گئے۔

مولوی محبوب عالم کی دُور رس نگاہوں نے اس بات کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ گوجرہ کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے تسلّط اور استحصال سے بچانے کے لئے مسلمان نوجوانوں کی ایک ایسی تنظیم کی اشد ضرورت ہے جو ہر وقت مُسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کے لئے ہندوؤں سے برسرِ پیکار رہے اور اس کا بیڑا سب سے پہلے انہوں نے اپنے گھر سے اٹھایا اور عنایت اللہ مرحوم کے سب سے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید کو ۱۹۱۸ء میں علمِ طبّ اور علمِ سیاست سیکھنے کے لئے دہلی بھیجا۔ اس وقت دہلی کو ہندوستان میں طبّ اور سیاست کا مرکز تسلیم کیا جاتا تھا، حکیم عبدالمجید نے دہلی میں جا کر آیورویدک یونانی طبیہ کالج میں داخلہ لیا۔ یہ کالج ان دنوں حکیم محمد اجمل خاں کی سرپرستی میں قائم تھا، جہاں طلبا کو طبّ کے ساتھ ساتھ سیاست کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان دنوں ڈاکٹر حبیب الرحمان اس کے پرنسپل اور حکیم محمد اجمل خان کالج کے بورڈ کے سیکرٹری تھے۔ ۱۹۲۱ء میں حکیم عبدالمجید اس کالج سے فارغ ہو کر گوجرہ واپس تشریف لے آئے اور ۱۹۲۴ء سے عملی سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد جداگانہ انتخاب میں مسلمانوں کو بلدیاتی اداروں میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی ملنے سے ہندو تلملا اُٹھے اور اس سے ہندو مُسلم تعصّب انتہا کو پہنچ گیا۔ ہندو ساہو کاروں نے قرضوں کی وصولی سختی سے شروع کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ شرح سُود میں اضافہ کر دیا۔ اس کی زد سب سے زیادہ مسلمانوں پر پڑی۔ مُسلمانوں کو ہندوؤں کے استحصال سے نجات دلانے کے لئے ۱۹۲۴ء میں حکیم عبدالمجید نے مسلم کوآپریٹو

سوسائٹی گوجرہ قائم کی اور خود اس کے پہلے پریذیڈنٹ منتخب ہوتے اور خلیفہ محمد عیسیٰ کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس طرح ۱۹۲۴ء میں حکیم عبدالمجید نے گوجرہ کی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا اور ۱۹۳۴ء میں پہلی بار گوجرہ کے میونسپل کمشنر مقرر ہوتے اور اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک بلدیہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۶ء میں میونسپل کمیٹی گوجرہ کے انتخابات میں وزیر چند ایڈووکیٹ پریذیڈنٹ اور حکیم عبدالمجید وائس پریذیڈنٹ منتخب کئے گئے اور وہ قیامِ پاکستان کے وقت تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وزیر چند ایڈووکیٹ کی نقل مکانی کے بعد ۱۹۵۰ء تک آپ پریذیڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں آپ نے سیاست سے ریٹائر ہونے کا اعلان کردیا۔ ۲۶ سال تک سیاست کو اوڑھنا بچھونا بناتے رکھنے کے بعد اس سے یکایک علیحدگی کے اعلان سے ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو سخت حیرانی ہوئی۔ اور وہ سب مل کر حکیم عبدالمجید کے پاس آئے اور اس یکایک فیصلہ کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا قیامِ پاکستان سے قبل گوجرہ میں ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک پڑھا لکھا مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھ پر خدا اور اس کے رسُول کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کروں اور اب قیامِ پاکستان کے بعد جب کہ یہاں سے ہندو چلے گئے ہیں اور تمام آبادی مسلمان ہے۔ خدا کی طرف سے مجھ پر یہ عائد شدہ فریضہ ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے اب میں نے سیاست کو خیرباد کہہ کر باقی زندگی یادِ الٰہی میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا ہے، چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عنایت اللہ مرحوم ۱۹۲۲ء میں محمدی محلہ گوجرہ میں پیدا ہوتے۔ آپ ابھی بمشکل ڈیڑھ سال کے تھے کہ ۱۹۲۳ء میں ان کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا اور آپ کی تمام تر پرورش آپ کے دونوں بڑے بھائیوں حکیم عبدالمجید اور حاجی محمد سعید نے کی۔ گوجرہ ہائی سکول سے

میٹرک کرنے کے بعد آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے انٹر کا امتحان پاس کیا اور چند ماہ تک ٹیلیفون آپریٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اس کے بعد نوکری چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور وہاں سے "بچوں کی دنیا" رسالہ جاری کیا۔ بعد ازاں لاہور واپس آکر "ہدایت" کی ادارت سنبھال لی

ماہ نامہ ہدایت کے بعد آپ نے راولپنڈی سے نصیر الدین ہمایوں سے مل کر روزنامہ "تعمیر" کا اجرا کیا وہاں کثرت کار سے کھانسی اور بخار کا شکار ہو گئے لیکن کام کی رفتار میں کوئی فرق نہ آنے دیا جس کے باعث ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔

علاج معالجے کے لئے ۱۹۵۲ء میں لاہور آ گئے جہاں سے ان کے بھائی حاجی محمد سعید انہیں اپنے پاس شیخوپورہ لے آئے اور اس وقت کے مشہور ٹی بی کے ماہر ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے علاج کرواتے رہے۔ صحت قدرے سنبھلی تو واپس راولپنڈی چلے گئے اس وقت کشمیر میں سردار محمد ابراہیم اور چودھری غلام عباس کے درمیان سیاسی مخالفت چل رہی تھی اور سردار محمد ابراہیم کو اس وقت کی حکومت کا تعاون حاصل تھا جس کی بنا پر اخبار کے مالکان سردار محمد ابراہیم کا ساتھ دے رہے تھے، جبکہ عنایت اللہ مرحوم اور ان کے ساتھی چودھری غلام عباس کے حق میں تھے۔ اخبار کی پالیسی پر اختلافات اور بعض کاروباری معاملات میں عدم اتفاق کی بنا پر اس اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں راولپنڈی سے نسیم حجازی کے ساتھ مل کر روزنامہ "کوہستان" جاری کیا بعد میں یہ روزنامہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک وقت راولپنڈی، لاہور اور ملتان سے شائع ہونے لگا، لیکن ۱۹۶۲ء میں انہیں نسیم حجازی سے انتظامی امور میں اختلاف کے باعث کوہستان سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور پھر ۱۹۶۳ء میں عنایت اللہ مرحوم نے روزنامہ "مشرق" کا اجرا کیا۔ اس موقع پر روزنامہ کوہستان کا کافی عملہ ان سے اپنے قلبی لگاؤ کی بنا پر عنایت اللہ مرحوم کے ساتھ شامل ہو گیا عنایت صاحب

اور ان کے ساتھیوں کو زبردست محنت اور جدوجہد کرنی پڑی اور اسی محنت اور جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ مشرق کو میدانِ صحافت میں منفرد مقام حاصل ہے۔ اس عرصہ میں آپ نے اخبار کو جدید رجحانات سے روشناس کرنے کے لئے بار بار یورپ کے دورے کئے اور وہاں کے اخبارات میں کئے جانے والے نئے نئے تجربات کو اپنے اخبار میں سمویا۔ ان کی اس مسلسل محنت سے ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ لیکن آپ نے اپنا مشن جاری رکھا اور بالآخر ۱۴ جولائی ۱۹۷۲ء کو جبکہ "مشرق" پاکستان کے چاروں صوبوں سے شائع ہو رہا تھا مولوی محبوب عالم کے اس نامور فرزند نے جسے جدید صحافت کا بانی کہا جاتا ہے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون۔ اب ان کے معتمد ساتھی اور رفیق کار ان کے چھوڑے ہوئے مشن کو کامیابی سے جاری رکھے ہوتے ہیں۔ مرحوم عنایت اللہ اپنے بزرگوں کا کس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شدید بیماری میں بھی جب ان کے بڑے بھائی ان کی تیمارداری کو آتے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور لاکھ منع کرنے کے باوجود اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک وہ چلے نہیں گئے۔ عنایت اللہ مرحوم سگریٹ نوشی کے عادی تھے لیکن انہوں نے زندگی بھر اپنے بزرگوں کے سامنے احتراماً سگریٹ نہیں پی۔ اپنی خوبیوں کے باعث دوست اور دشمن بھی ان کے معترف تھے۔

عطا اللہ سُبحانی

میرا بھائی

عنایت اللہ میرے بھائی تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے۔ ہم قصبہ گوجرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ بچپن اکٹھے گزرا۔ گھر میں آسودگی اور قناعت تھی۔ البتہ ۱۹۲۳ء میں والد صاحب کی اچانک وفات سے گھر کا نقشہ بگڑ گیا۔ والد مرحوم مولوی محبوب عالم اپنے زمانہ کے جید عالم دین اور قابل طبیب تھے۔ گوجرہ کمیٹی کی سرکاری زمین ٹھیکہ پر لیتے اور خود کاشت کرواتے تھے۔ سر سیّد مہدی شاہ مرحوم ان کے مداح اور دوست تھے اس لئے گھر میں خوشحالی اور علاقہ میں بڑی عزت تھی۔

والد صاحب کی وفات کے بعد ہماری مالی حالت کمزور ہوتی چلی گئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد میں اچھرہ لاہور میں رہنے لگا۔ عنایت اللہ اس وقت ساتویں کا طالب علم تھا۔ میں نے اسے بھی لاہور بلوا لیا۔ اور انجمن حمایت اسلام کے مڈل سکول میں داخل کرا دیا جو اچھرہ میں تھا۔ گرمی کی چھٹیاں آئیں تو میں نے اس کا بستہ الماری میں بند کر دیا اور اسے غیر نصابی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ عنایت کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ میں اسے پبلک لائبریری اور دیال سنگھ لائبریری لے گیا۔ اس زمانہ میں عطر چند کپور کتابوں کا بہت بڑا ناشر تھا۔ اس نے اردو کے مشہور شاعروں کے منتخب کلام شائع کئے تھے۔ ان کے چند سیٹ

لے کر میں نے عنایت اللہ کو پڑھنے کے لئے دیتے۔ طالب علمی کے زمانے میں عنایت کو شعر و شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ بعض منتخب اشعار وہ اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرتا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہماری گلی سے ہر روز خاکسار رہنما علامہ عنایت اللہ المشرقی خاکی قمیض پاجامہ پہنے اور کندھے پر بیلچہ رکھے گزرا کرتے تھے۔ میں اپنے بھائی کی توجہ ان کی طرف دلاتا اور کہتا، دیکھو عنایت وہ تمہارے ہم نام علامہ مشرقی جا رہے ہیں۔ تم بھی محنت سے مطالعہ کرو تو دنیا میں اپنا نام پیدا کر سکتے ہو۔ وہ یہ بات سنتا اور مسکرا دیتا۔

اگلے سال عنایت اللہ شیخوپورہ چلے گئے اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ میں ان دنوں جے اے وی پاس کر کے موضع گنجہ کلاں میں ورنیکلر ٹیچر کی حیثیت سے ۲۰ روپے مشاہرہ پر ملازم تھا۔ چھ روپے پوسٹل الاؤنس ملتا تھا جو میں عنایت کو بھیج دیتا تھا۔ عنایت اللہ نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اور گرمیوں کی چھٹیوں میں سیر و تفریح کے لئے میرے پاس آ گئے۔ سردار محمد حسین مرحوم رئیس گنجہ کلاں میرے بڑے دوست اور مشفق عزیز تھے۔ اکثر عنایت اللہ صاحب کو شام کے کھانے پر بلا لیتے۔

ایک دن علی الصبح ہم دونوں بھائی دریا کی سیر کو نکلے۔ دریا کے قریب پہنچے تو عنایت صاحب نے زور سے چھلانگ لگائی دیکھا تو سامنے دو سانپ سر اٹھاتے پھنکار رہے تھے۔ دو قدم آگے گئے تو پھر یہی حادثہ پیش آیا۔ بولے "بھائی خدا کو میری زندگی عزیز ہے یا شاید قدرت کو مجھ سے کوئی کام لینا ہے جو میری زندگی بچ گئی"۔

کالج میں انہیں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور ان کی لکھی ہوئی کہانیاں بچوں کے رسالوں میں چھپنے لگیں۔ ایک دفعہ لاہور کے رسالہ بچوں کی دنیا میں عنایت کی ایک تخلیقی کہانی میری نظر سے گزری۔ اس کا انداز بیان اور نفس مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ میں گاؤں سے لاہور آیا تو ریلوے روڈ پر قومی کتب خانہ میں محمد احسن صاحب سے ملا۔

میں نے ان کو عنایت کی طبع زاد کہانی دکھائی۔ وہ بھی داد دیتے بغیر نہ رہ سکے۔ اگلے روز میں عنایت کو ساتھ لے کر قومی کتب خانہ گیا اور احسن صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ احسن صاحب نے انہیں اپنے رسالہ میں اعزازی طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی اور وہ "ہدایت" کے مدیر بن گئے۔ اس وقت وہ ایف اے پاس کر چکے تھے۔

عنایت اللہ کے تعلیمی اخراجات بڑے بھائی حکیم عبدالمجید صاحب برداشت کرتے تھے۔ مگر مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے عنایت اللہ اپنی تعلیم پوری نہ کر سکے اور انہوں نے کالج چھوڑ کر نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ آخر انہیں لائل پور پوسٹ آفس میں ۴۵ روپے ماہوار پر کلرک کی اسامی مل گئی۔ ملازمت کے دو ماہ بعد وہ مجھے ملے اور کہنے لگے کہ "مجھے کلرکی پسند نہیں میں کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتا ہوں۔"

اس واقعہ کے چند روز بعد عنایت اللہ نے اپنی والدہ محترمہ سے کچھ روپے لئے اور لاہور چلے گئے۔ چھ ماہ بعد انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں کلکتہ میں ہوں۔ رات کو ایک روزنامہ میں خبروں کے ترجمہ اور ترتیب کا کام کرتا ہوں اور دن کو "بچوں کی دُنیا" کی ادارت اور اشاعت میں سرگرداں رہتا ہوں۔ یہ عنایت کا پہلا پرچہ تھا جو انہوں نے بچوں کے لئے نکالا تھا۔ میں اس پرچہ کی پچاس کاپیاں منگوا لیتا اور ان کی قیمت اپنی جیب سے بھیج دیتا۔ کچھ پرچے گوجرہ سکول میں طلبا کے پاس رعایتی قیمت پر فروخت کر دیتا اور کچھ پرچے میں نے بعض سرکاری سکولوں میں لگوا دیتے۔ عنایت اللہ کو کلکتہ گئے دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ جاپانی فضائیہ نے کلکتہ پر بمباری کر دی۔ پھر کیا تھا ایک بھگدڑ مچ گئی۔ عنایت لاہور پہنچے اور اپنے پرانے دوست محمد احسن کے ساتھ کام کرنے لگے۔ "ہدایت" کی ادارت کے علاوہ وہ قومی کتب خانہ کی دیگر مطبوعات کی اصلاح، ترتیب و تزئین میں دن رات مصروف رہتے۔ انہوں نے کتابوں کو پہلی بار ڈسٹ کور سے آراستہ کیا۔ اور خدا کے فضل سے

کتابوں کی فروخت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور قومی کتب خانے کو خوب آمدنی ہوتی۔ اس کے بعد شیخ نصیر دین ہمایوں صاحب نے راولپنڈی سے ایک روزنامہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ عنایت اللہ کو روزنامہ تعمیر کا پرنٹر اور پبلشر بنادیا گیا۔ نسیم حجازی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ عنایت اللہ کام کرنے کے دھنی تھے۔ اخبار کی کامیابی کے لئے خوب جانفشانی محنت اور لگن سے کام کیا۔ پرچہ مقبول ہوا مگر خود تپ دق کا شکار ہو کر ہسپتال چلے گئے۔

عنایت اللہ بڑے جری اور صابر تھے۔ انہوں نے بیماری کی صعوبتیں صبر، حوصلہ اور خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ اللہ تعالیٰ نے شفا دی تو پھر میدانِ صحافت میں کود پڑے۔ پہلے کوہستان نکالا اور اسے بامِ عروج تک پہنچایا پھر کوہستان سے علیحدگی اختیار کر کے مشرق شائع کیا اور اسے بھی اپنے باہمت اور محنتی ساتھیوں کی بدولت آسمانِ صحافت کا چاند بنادیا۔

حفیظ سرور

جب آتش جوان تھا

مجھے بچپن سے عنایت اللہ مرحوم کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے لائلپور کے بارونق قصبہ گوجرہ میں ہم ایک محلہ اور گلی میں رہتے تھے عنایت صاحب شروع ہی سے خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں اور رسائل پر جان چھڑکتے تھے، مطبوعات کی اسی دیدہ زیبی کے زیر اثر وہ اکثر ٹھوس معلوماتی چیزیں پڑھ جاتے۔

ہم چند دوست ان دنوں اپنی استعداد کے مطابق مضامین اور افسانے لکھتے، میں اپنی تک بندی کی وجہ سے شاعر بھی تھا مگر عنایت صاحب ہمیشہ لکھنے لکھانے سے کتراتے وجہ پوچھنے پر کتاب دکھا کر کہتے پہلے علم کو اپنے بس میں کرنا چاہئے لکھنے کے لئے عمر پڑی ہے،

دراصل انہیں خوبصورت انداز میں لٹریچر PRODUCE کرنے کا بے حد شوق تھا، انگریزی رسالوں کو دیکھ کر ان کا یہ شوق اس عجیب و غریب خواہش میں بدل جاتا کہ کل ہی ایسا انتظام ہو جائے کہ وہ کوئی چیز بہترین طریقہ سے چھاپ کر سب کو دکھا سکیں مجھے چونکہ مصوری سے لگاؤ تھا اس لئے اپنے مشن کا اہم رکن جان کر وہ مجھے ہمیشہ ہمراہ رکھتے کبھی مطالعہ کے دوران کسی بڑی شخصیت سے متاثر ہوتے

توان کا ذہن مستقبل کے منصوبوں کی طرف مائل ہو جاتا اور مجھ سے مخاطب ہو کر اچھی خاصی تقریر کر ڈالتے۔

متحدہ ہندوستان کا دور تھا ان دنوں ہندؤوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حالت ہر شعبۂ حیات میں پتلی تھی ملازمت کا حصول انتہائی دشوار تھا۔ شومئ قسمت سے جب کسی مسلمان کو معمولی ملازمت بھی مل جاتی تو یہ بڑے معرکے کی بات سمجھی جاتی تھی عنایت صاحب کا طبعی رجحان بھی مسلمانوں کی اسی عام پس ماندگی کی بھینٹ چڑھ گیا، انٹرمیڈیٹ پاس کیا تو ان کے بزرگ لائل پور کے ڈاک خانہ میں انہیں پوسٹل کلرک کی نوکری دلوا کر پھولے نہ سماتے تھے ادھر عنایت صاحب کا دل غم و غصہ سے کٹ رہا تھا بمشکل تین مہینے گزرے تھے کہ ایک شام میرے نام عنایت صاحب کا مکتوب کلکتہ سے موصول ہوا طمانیت سے بھرپور تحریر میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ بچوں کی دنیا کے ڈیکلریشن کی درخواست دے دی گئی ہے تم پہلی فرصت میں کلکتہ روانہ ہونے کی کوشش کرو میری اور تمہاری گمشدگی کا کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے خط پڑھ کر پہلے تو میں سناٹے میں آگیا۔ پھر فوراً ہی میں نے اپنے ضدی اور جگری دوست کے ارادوں کی تکمیل میں معاون بننے کا فیصلہ کر لیا اور چودہ سو میل کی طویل مسافت طے کرتا ہوا تیسرے روز کی ایک صبح کو میں ہوڑہ سٹیشن پر اترا اور اپنے یار سے نمناک آنکھوں کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ میں عنایت اللہ کو پردیس میں پاکر جذباتی ہو گیا تھا لیکن اسے میرے آنسو بالکل اچھے نہیں لگے، یہ زندگی کی پہلی جدوجہد میں اس کے نزدیک بدشگونی تھی ہمارا رکشا جسے ایک کالا کلوٹا ہندو بنگالی کھینچتا ہوا بھاگا جا رہا تھا جب دریائے ہگلی کے پل پر پہنچا تو بھیگی بھیگی ہوا نے عنایت صاحب کی سنجیدگی کا تار و پود بکھیر دیا مسکرا کر بولے "۔ تمہاری پہلی نظم جو بچوں کی دنیا میں چھپے گی۔ اس کا عنوان "رکشا والا" ہونا

چاہیئے مزید کہا میں نے پرچہ نکالنے کے لئے موضوعات سے بھرے ہوتے دیس کو منتخب کیا ہے"۔

یہ داستان تفصیل طلب ہے ۔یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ہماری یہ جدوجہد اگرچہ چھوٹے پیمانے پر تھی مگر اس دوران میں عنایت صاحب کے عزم واستقلال ۔محنت شاقہ اور مقصد سے لگن کی ایسی مثالیں میرے ذہن پر مرتسم ہوگئیں جو اِس منزل کے ہر راہی کے لئے مشعل راہ ہونی چاہئیں بہرصورت کلکتہ میں پرچہ نکالنے کا تجربہ ہوا اور خوب ہوا پھر ہم لوگ لاہور چلے آئے

غالبًا ۱۹۴۵ء کی بات ہے ، دسمبر کا مہینہ تھا اس روز دھوپ شفاف اور گرم تھی ۔ زراعتی کالج لائل پور کی رفیع الشان عمارت کے شمالی کونے میں ہیڈ آرٹسٹ کے کمرے میں بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ کمرے میں کسی کے داخل ہونے کی آہٹ محسوس ہوئی اور پھر "السلام علیکم" کی جانی پہچانی آواز گونجی۔میں نے خوردبین سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔عنایت اللہ مسکراتے ہوئے بڑھ رہے تھے چہرے پر سفر کی دھول تھی ،لیکن ان کی پیشانی حسبِ معمول چمک رہی تھی بچپن کے ساتھی اور جگری دوست کی آمد میرے لئے اتنی اچانک اور مسرت افزا تھی کہ میں سلام کا جواب بھی نہ دے سکا اور دوڑ کر ان سے بغل گیر ہوگیا۔

اس ملاقات کے دوسرے روز میں عنایت اللہ کے ہمراہ ریل میں سفر کر رہا تھا ، ہماری منزل مقصود لاہور تھی ، لاہور میں عنایت اللہ نے بچوں کے ایک پندرہ روزہ پرچہ کی ایڈیٹری قبول کر لی تھی ، اچھے اچھے مضامین فراہم کرنے کے علاوہ پرچہ کو زیادہ سے زیادہ مصور کرنے کا بھی خیال تھا ۔اس سلسلے میں وہ مجھے لینے آئے تھے ،

عنایت اللہ کی شخصیت میں اس وقت بھی آہنی عزم واستقلال کا پہلو اتنا

نمایاں تھا کہ میں ان کی تجویز کے سامنے اپنی کسی سوچ۔ کسی دلیل میں وزن تلاش نہ کر سکا اور چپ چاپ سرکاری ملازمت پر لات مار کران کے ساتھ ہو لیا۔

ان دنوں میری شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے تھے۔ ملازمت بھی تازہ تھی، درپردہ یہ نقل مکانی میرے لئے ایک بڑے حادثہ سے کم نہ تھی لیکن بعد میں جب بھی میں نے اس حادثہ کے متعلق سوچا عنایت اللہ مجھے فرشتۂ رحمت معلوم ہوئے۔

صحافت کی دنیا میں عنایت اللہ کی منفرد شخصیت کبھی فراموش نہ ہو سکے گی۔ اس مردِ درویش کے ساتھ گزارے ہوئے طویل ماہ وسال بہت سی تابناک جھلکیاں لئے ہوئے ہیں، مجھے یاد ہے "روزنامہ تعمیر" راولپنڈی سے علیحدگی کے بعد جب عنایت اللہ نے بے سروسامانی کے باوجود راولپنڈی ہی میں جامع مسجد روڈ پر ایک نئے روزنامہ "کوہستان" کا لمبا چوڑا سائن بورڈ آویزاں کروا دیا تو کم از کم مجھے قطعی طور پر یہ سب کچھ "دیوانے کا خواب" معلوم نہیں ہوا۔ کیونکہ میرے سامنے عنایت اللہ تھا۔ عنایت اللہ کو جاننے اور ماننے والا اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جہاں عنایت اللہ ہے وہاں سب کچھ ہے، انتہائی نامساعد حالات کا استقامت سے مقابلہ کرنا اور ان پر قابو پانے کے لئے وسائل مہیا کرنا عنایت اللہ کا محبوب مشغلہ تھا اور یہ مشغلہ فن صحافت کی ترویج کے اس اعلیٰ مقصد کے لئے ہوتا تھا جو عنایت اللہ کے لئے آخر دم تک اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ اس کی تمام حسیات اس مرکز کی مرہون منت تھیں۔

کسی زمانہ میں جب وہ پندرہ روزہ پرچہ کا ایڈیٹر تھا تو کہتا تھا "مجھے شادی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" "جب ہر پندرہ روز کے بعد مجھے ایک خوبصورت بچہ مل جاتا ہے اور واقعی وہ اس پرچہ کو اپنا حقیقی بچہ سمجھتا تھا جس کی رگ رگ میں اس کی روح جاری وساری تھی۔ جب تک یہ چھپ کر سامنے نہیں آتا تھا عنایت اللہ کو

کھانا پینا اور آرام کرنا حرام تھا۔ اس دوران میں مجھے ٹیلی فون پر احباب کے استفسار کا اکثر ایک ہی جواب دینا پڑتا تھا۔ "وہ پریس گئے ہیں"

عنایت اللہ اپنی نگرانی کاتب سے شروع کرتے اور پریس کے مشین مین اور پھر دفتری کی دکان تک کرتے چلے جاتے۔ طباعت کے بعد اگر کچھ کمی محسوس کرتے تو اس کو اگلی اشاعت میں دور کر دینے کا دل ہی دل میں اسی وقت عزم کر لیتے اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی نئے دلچسپ موضوع کا اضافہ بھی کر دیتے تاکہ پڑھنے والے یکسانیت کے باعث اکتاہٹ سے دوچار نہ ہوں۔

صحافت سے اس نوع کی لگن رکھنے والا عنایت اللہ "کوہستان" اخبار کے اجرا کے ساتھ ساتھ مشکلات کے کوہستان سے بھی ٹکرایا اور اپنے آہنی عزم، بے مثال سوجھ بوجھ اور نت نئی کوششوں کے بل پر حائلات راہ کو ٹھکراتے ہوئے گزر گیا۔ راولپنڈی میں "کوہستان" کی مقبولیت کے بعد لاہور اور پھر ملتان سے اس کی اشاعت دیکھتے ہی دیکھتے ناقابلِ یقین اعداد و شمار تک پہنچا دی۔

یہ کامیابیاں عنایت اللہ کے صحافت سے والہانہ لگاؤ ہی کا نتیجہ تھیں تاہم اس والہانہ لگاؤ کی حدود بھی کچھ کم لمبی چوڑی نہ تھیں جن کو چھو لینا عنایت اللہ ہی کا کام تھا۔ انہوں نے اخبار کے تمام شعبوں کو فرسودہ روایات سے ہٹ کر نئے انداز سے منظم کیا۔ ان کا قول تھا کسی چیز میں نئے پن کے بغیر دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اب سے بہت پہلے جب وہ ایک چھوٹے سے کمرہ میں چارپائی، بستر، میز، کرسی اور مطالعہ کی ان گنت کتابوں کے ساتھ رہا کرتے تھے تو وہ ہر ہفتہ ان اشیاء کی نشست بدل دیتے تاکہ نئے پن کے احساس سے اکتاہٹ قریب نہ آنے پائے ان کی یہی فطرت اخبار کے کاروبار میں جھلکتی تھی، انہوں نے پہلے تو اخبار کے اسلوب

طباعت کو بدلنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ پھر صفحات کو نئے لے آؤٹ، منفرد اندازِ کتابت مفید اور دلچسپ مستقل کالم (خصوصاً اسلامیات کا کالم) وغیرہ اور نئی طرز کی اخباریت بخشی،

اس مقصد کے لئے عنایت اللہ نے اپنی خواہش اور مزاج کے مطابق عملہ ٹرینڈ کرنے میں بڑی محنت کی اس سے یہ فائدہ ہوا کہ خاص سانچہ میں ڈھلا ہوا عملہ کوہستان برادری کی صورت اختیار کر گیا اور اس کی شکست و ریخت کے امکانات جاتے رہے ادھر سے مطمئن ہو کر کارکنوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی سوجھی کیونکہ عنایت اللہ کو معمولی سے معمولی کارکن کی عزتِ نفس بے حد عزیز تھی انہوں نے صحافیوں کے اجرت بورڈ کے ایوارڈ سے پیشتر ہی عملہ کی تنخواہیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر حکماً اس بات کا اہتمام کیا کہ خوش نویس سے ایڈیٹر تک سب لوگ سوٹ پہن کر دفتر میں آئیں خوشنویس حضرات کو کرسیوں پر بیٹھ کر کتابت کا فریضہ انجام دینے کا کامیاب تجربہ کیا عملہ کو اس قدر معزز بنا کر اور سہولتیں فراہم کر کے عنایت اللہ اپنے مخصوص محاسبہ سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہ ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنی انتھک محنت سے اٹھائی ہوئی عمارت کو نہ صرف مضبوط دیکھنا چاہتے تھے بلکہ وہ اپنی جدوجہد کو دوسروں کے لئے "مثالی" بھی بنانا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش حقیقت کے روپ میں آج سب کے سامنے ہے،

"کوہستان" کے بعد عنایت اللہ نے "مشرق" کا اجراء کیا جس میں اپنے قارئین کو مزید نئی باتوں سے روشناس کرایا گیا، اخبار بڑے سائز کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہر طبقہ کے ذوق کے تحت بھرپور مواد رنگین اور سادہ تصاویر سے سجا کر پیش کیا۔

اخباری دنیا میں ایڑی چوٹی تک انقلاب لانا عنایت اللہ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جسے صحافت کی تاریخ میں جلی حروف میں لکھا جانا چاہیئے۔

غم واندوہ کی شدت قلم کا ساتھ نہیں دے رہی۔ عنایت اللہ کی شخصیت کے کئی روپ ہیں، انہوں نے دوستی بھی کی۔ دشمنی کو بھی روا رکھا لیکن ان کی دشمنی دوستی، محبت اور انسانیت کی چاشنی سے کبھی خالی نہ تھی۔

روزنامہ مشرق کے اجراء کے بعد ہمارے برسوں کے تعلقات گو کشیدہ رہے تاہم مجھے ہر لمحہ یہ سکون بخش احساس رہا کہ میرا دوست عنایت اللہ اسی لاہور میں ہے اسی سرزمین پر چلتا پھرتا ہے، اٹھتا بیٹھتا ہے، سوتا ہے جاگتا ہے، ہم دونوں اکٹھے یہاں آئے اور اکٹھے مرنے کی آرزو رکھتے تھے مگر آہ موت کو دوستوں کے عہد و پیماں سے کیا واسطہ۔

محسن صحافت

عنایت صاحب کی صحافتی خدمات

ماہنامہ بچوں کی دُنیا کلکتہ ———— ۱۹۴۴ء

ماہنامہ ہدایت لاہور ———— ۱۹۴۶ء

روزنامہ تعمیر راولپنڈی ———— ستمبر ۱۹۴۹ء

روزنامہ کوہستان راولپنڈی ———— ۲۳-۱۰-۵۳

روزنامہ کوہستان لاہور ———— ۲۳-۳-۵۶

روزنامہ کوہستان ملتان ———— ۲۱-۴-۵۹

روزنامہ مشرق لاہور ———— ۱۶-۹-۶۳

ہفت روزہ اخبار خواتین کراچی ———— ۲۸-۲-۶۶

روزنامہ مشرق کراچی ———— ۱۶-۴-۶۷

روزنامہ مشرق پشاور ———— ۱-۸-۶۷

روزنامہ مشرق کوئٹہ ———— ۳-۶-۷۲

ہفت روزہ مشرق لندن ———— ۱۹۶۱ء

ہفت روزہ اخبارِ وطن لندن ———— ۱۹۶۹ء